میرے دادا جان قیصر عابدی مرحوم
دیگر کمالات کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مترجم تھے۔
ان کی یہ کاوش ان کے لیے دعا کی درخواست
کے ساتھ پیش خدمت ہے

علیزا بتول
www.fb.com/QaisarAbidi

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایک امریکی سیاہ فام غلام کی سرگزشت)

تالیف: سُو ایکن، جوزف لاگزڈن

ترجمہ: قیصر عابدی

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایک امریکی سیاہ فام غلام کی سرگزشت)

تالیف: سُو ایکن، جوزف لاگزڈن

ترجمہ: قیصر عابدی

یہ سچی آپ بیتی

آزادی و جمہوریت کے دعویدار مُلک

امریکہ کے ان ہزاروں غلاموں میں سے ایک غلام کی ہے

جسے آزاد شہری ہونے کے باوجود

محض سیاہ فام ہونے کی پاداش میں

برسوں جبری غلامی، تشدد اور اذیت برداشت کرنا پڑی

تالیف	سوایکن، جوزف لاگزڈن
ترجمہ	قیصر عابدی
سنِ اشاعت	۲۰۰۹ء

ا

میری پیدائش ایک آزاد شہری کے گھر میں ایک آزاد انسان کی حیثیت سے ہوئی اور تیس سال کی عمر تک میں ایک آزاد ریاست میں آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتا رہا لیکن پھر محض سیاہ فام ہونے کے باعث مجھے اغوا کر کے غلام کے طور پر فروخت کر دیا گیا، اور بارہ برس کی پُر تشدد غلامی کے بعد ایک طویل جدو جہد کے نتیجے میں ۱۸۵۳ء میں مجھے دوبارہ آزادی کی نعمت نصیب ہوئی۔

میں غلامی کے بارے میں صرف وہی کچھ بیان کر سکتا ہوں جو ذاتی طور پر مجھ پر بیتی یا میرے مشاہدے اور تجربے میں آئی۔ اس آپ بیتی کا مقصد بغیر کسی مبالغے کی آمیزش کے محض ٹھوس حقائق کو سچائی اور سادگی سے بیان کر دینا ہے نہ کہ افسانوی رنگ آمیزی اور دلچسپی پیدا کرنا ہے۔

اپنے ماضی کے بارے میں جہاں تک مجھے بتایا گیا اور جس حد تک میری یادداشت کام کرتی ہے، میرے آباؤ اجداد رھوڈ آئی لینڈ کے نارتھپ نامی سفید فام زمیندار خاندان کے غلاموں میں سے تھے۔ اس خاندان کے ایک صاحب نے جب رھوڈ آئی لینڈ سے شمالی امریکہ کی ریاست نیویارک کی طرف ہجرت کی تو اپنے ساتھ میرے والد منٹ نارتھپ کو بھی لیتے آئے۔ اور آج سے

تقریباً پچاس برس پہلے اُن کے انتقال پر اُن کی وصیت کے مطابق میرے والد غلامی کے بندھنوں سے آزاد ہو کر آزاد شہری بن گئے۔ یہ آزادی غالباً ان کے آقا کی طرف سے ان کی طویل اور پُرخلوص خدمات کا انعام تھا۔

سینڈی ہل کے معروف ایڈووکیٹ مسٹر ہنری بی نارتھپ جن کی کوششوں اور قابلیت کے نتیجے میں میری بارہ برس کی غلامی ختم ہوئی، اسی نارتھپ خاندان کے ایک فرد تھے اور اسی خاندان کی مناسبت سے ہم لوگ بھی نارتھپ کہلاتے ہیں۔ آزادی کے حصول کے بعد میرے والد نیویارک کی ایک کاونٹی منروا میں منتقل ہو گئے جہاں جولائی ۱۸۰۸ء میں میری پیدائش ہوئی۔ ایک عرصے تک اس کاونٹی میں رہنے کے بعد ہم لوگ سینڈی ہل کے قصبے کے قریب مسٹر رسل پریٹ کے فارم پر آ گئے جہاں میرے والد ۱۸۲۹ء تک ملازمت کرتے رہے۔ اور یہیں ۲۲ر نومبر ۱۸۲۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے لواحقین میں میرے علاوہ میری والدہ اور بڑا بھائی جوزف تھے۔ والدہ کا انتقال میری غلامی کے دوران ہو گیا۔ جبکہ بھائی آسویگو کاؤنٹی میں آباد ہو گئے۔

میرے والد نے اپنی تمام عمر زرعی فارموں پر کھیت مزدور کے پیشے سے وابستہ رہ کر گزاری۔ وہ اپنی ایمانداری، محنت اور جفاکشی کی وجہ سے معاشرے میں ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھے گئے۔ انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو مناسب تعلیم دلانے کے علاوہ ہم میں اعلیٰ اخلاق اور خدا خوفی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے اتنی جائداد بنالی تھی کہ ہمارے خاندان کو ووٹ ڈالنے کا حق بھی حاصل ہو گیا تھا۔ اُن کے انتقال کے وقت تک تو میں اُن کے ساتھ کھیتوں میں مزدوری کرتا تھا البتہ فرصت کے اوقات میں کتابیں پڑھنا اور

وائلن بجانا میرے پسندیدہ مشغلے تھے۔ خصوصاً وائلن لڑکپن ہی سے میری روح کی غذا تھی۔

۱۸۲۹ء میں کرسمس کے روز میری شادی ایک نیگرو لڑکی این ہمپٹن سے ہوگئی۔ شادی کے دن سے آج تک این نے مجھے اپنے خلوص اور محبت کے بے پایاں جذبے سے سرشار رکھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد میں نے لکڑی کے تختوں اور لٹھوں کو چمپلین جھیل سے ٹرائے تک پہنچانے کے ٹھیکے لینے شروع کر دیئے۔ جلد ہی میں اس کاروبار کے اسرار و رموز سے واقف ہو گیا اور اس میں خاصا منافع حاصل کیا۔ اسی دوران کاروبار کے سلسلے میں مجھے کینیڈا کے مختلف شہروں میں جانے کا موقع ملا۔ ان ٹھیکوں کی تکمیل کے بعد این اور میں نے اپنے آبائی پیشے زراعت کی طرف لوٹنے کا ارادہ کرتے ہوئے پچیس ایکڑ کے ایک فارم پر مکئی کی کامیاب کاشت کی۔ ساتھ ہی میرا وائلن بجانے کا شوق بھی عروج پاتا گیا۔ یہاں تک کہ اب گردونواح میں مجھے تقریبات کے موقع پر وائلن نواز کے طور پر بلایا جانے لگا اور این کو علاقے کے اچھے ہوٹلوں میں کھانا پکانے کی ملازمت معقول مشاہروں کے عوض ملنے لگی۔

۱۸۳۴ء میں ہم لوگ سراٹوگا میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے جہاں یونائیٹڈ اسٹیٹس ہوٹل اور دیگر ہوٹلوں میں این کو ملازمت ملتی رہی اور میں مختلف فارموں میں زراعت کے پیشے سے منسلک رہا۔ اسی شہر میں ہم تین بچوں الزبتھ، مارگریٹ اور الانزو کے والدین بھی بن گئے جن کے باعث ہماری زندگی میں عجب طرح کی رنگینیاں اور دلچسپیاں پیدا ہو گئیں۔

یہاں تک ۱۸۴۱ء کا زمانہ آ گیا جہاں سے میری داستانِ حیات کا تاریک ترین دور شروع ہوتا ہے جس کے مکمل اظہار کے لئے میں نے اس تحریر کا سہارا لیا ہے۔ اپنے اغوا، جبری غلامی اور بارہ سالہ جسمانی و ذہنی تشدد کی جو تصویر کشی میں نے کی ہے وہ حقیقت سے کتنی قریب ہے اس کا ثبوت ان کاونٹیز کا دستاویزی ریکارڈ ہے جہاں مجھے رکھا گیا۔ اس بہیمانہ سلوک کے گواہ خود اس کہانی کے مختلف کردار اور وہ غلام مرد اور خواتین ہیں جو میرے ساتھ غلامی کی کوٹھریوں، عقوبت خانوں اور جبری مشقتوں کے مراکز میں زندگی گزارتے رہے یا اب تک گزار رہے ہیں۔

۲

مارچ ۱۸۴۱ء کے آخری ہفتے میں جب کہ میں کسی ملازمت یا کاروبار سے منسلک نہ تھا ایک صبح کسی مناسب روزگار کی تلاش میں اپنے قصبے سراٹوگا کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ اُس دن این حسبِ معمول شہر سے بیس میل کے فاصلے پر شیرل کافی ہاؤس میں اپنی ملازمت پر تھی اور الزبتھ کو ساتھ لے گئی تھی جبکہ مارگریٹ اور الانزو اپنی خالہ کے گھر گئے ہوئے تھے۔ کانگریس اسٹریٹ کے موڑ پر مجھے معزز وضع قطع کے دو ایسے آدمی ملے جو میرے لئے قطعی اجنبی تھے البتہ انہوں نے مجھے ایک معروف وائلن نواز کے طور پر پہچان کر گفتگو کا آغاز کیا اور باتوں باتوں میں وائلن ہی کے حوالے سے میری خدمات ایک مختصر عرصے کے لئے حاصل کرنے کی پیشکش کی۔ انہوں نے اپنے نام براؤن اور ہملٹن بتائے جو بعد میں جعلی ثابت ہوئے۔ براؤن تقریباً چالیس سال کے پیٹے میں چھوٹے قد اور گٹھے جسم کا مالک تھا۔ وہ سیاہ ہیٹ اور کوٹ میں ملبوس اپنے بشرے سے خاصا ذہین اور جہاندیدہ نظر آتا تھا جبکہ ہملٹن لمبے قد، گوری رنگت اور نیلی آنکھوں کا

تقریباً پچیس سالہ نوجوان خاصے جدید اور فیشن ایبل لباس میں تھا۔ اس کی رفتار
میں قدرے نسائیت کی جھلک نمایاں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بطور فنکار واشنگٹن
کے ایک معروف سرکس سے وابستہ ہیں اور آج کل شمالی علاقوں کے تفریحی اور نجی
دورے پر نکلے ہیں۔ اپنے سفری اخراجات پورے کرنے کے لئے وہ کہیں کہیں
چھوٹے موٹے اسٹیج شو بھی کر لیتے ہیں اور اب واشنگٹن واپس جاتے ہوئے
نیو یارک میں ایک پرفارمنس دینا چاہتے ہیں جس میں موسیقی کی شمولیت کے لئے
انہوں نے مجھے معقول معاوضے کی پیشکش کی۔ چونکہ میں ان دنوں فارغ تھا اور
شیرل سے این کی واپسی بھی ایک ہفتے سے پہلے متوقع نہ تھی اس لئے نیو یارک کی
سیر اور فن کے اظہار کا اچھا موقع سمجھ کر میں نے پیشکش قبول کر لی اور مناسب
لباس اور وائلن کے ساتھ تیار ہو کر اُن کے ساتھ ہو لیا۔ رات ہونے سے کچھ
پہلے ہم ان کی گاڑی میں البنی (نیو یارک) کے ایک ہوٹل پہنچ گئے جہاں ہال میں
تقریب کا اہتمام تھا۔ میں نے آرکسٹرا ترتیب دیا اور ان دونوں نے اپنی صدا
کاری کے مختلف انداز پیش کئے۔ میں نے محسوس کیا کہ تماشائیوں کی تعداد خاصی کم
تھی جس پر انہوں نے بتایا کہ ان کا اصل مرکز تو واشنگٹن ہے اور یہاں جلدی میں
مناسب پبلسٹی بھی نہ ہو سکی۔ بہر حال اگلی صبح میں تو فیملی اور دوستوں کے درمیان
واپس جانے کی تیاری کرنے لگا جبکہ ہملٹن اور براؤن واشنگٹن کی تیاریوں میں
مصروف ہو گئے اور ساتھ ہی مجھے بھی اپنے ہمراہ چلنے کی ترغیب و تحریص دلانے
لگے۔ انہوں نے نہ صرف بہتر اور معقول معاوضے کی امید دلائی بلکہ یہ سمجھانے کی

کوشش کی کہ اب جبکہ موسمِ گرما کی آمد آمد ہے سرکس جلد ہی شمالی علاقوں کے دورے پر نکلے گا اور وہاں سے میرا شہر دور نہ ہوگا اس طرح میں گھوم پھر کر اپنے خاندان اور دوستوں کے قریب ہی رہوں گا ۔ انہوں نے میرے فن کی اتنی تعریفیں کیں اور ایسا خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا کہ میں اُن کے سحر میں گرفتار ہو کر ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اگلے ہی روز ہم فلاڈلفیا سے ہوتے ہوئے بالٹی مور جا پہنچے۔ یہاں شب بسری کے لئے ایک ہوٹل میں مقیم ہوئے ۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھی جلد از جلد سرکس کے مقام پر پہنچ جانے کے لئے بیتاب ہیں۔ اگلی صبح ہم بذریعہ کار روانہ ہو کر غروب آفتاب کے وقت واشنگٹن پہنچ گئے ۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک دن بعد ہی پورا شہر جنرل ہیریسن کی سرکاری اعزاز کے ساتھ آخری رسومات اور تدفین کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہم لوگ ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے ۔ رات کے کھانے کے بعد ہملٹن اور براؤن نے اپنے کمرے میں بلا کر مجھے معاوضے کے طور پر پینتالیس ڈالر کی رقم ادا کر دی جو میری توقعات سے کافی زیادہ تھی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جنازے کی رسومات کی وجہ سے اب ہمارا اس کے بعد ہی سرکس پہنچنا مناسب ہوگا۔ اس دوران انہوں نے مجھ سے انتہائی مہربانی اور خلوص کا برتاؤ رکھا اور میرے آرام و آسائش کا خیال کرتے رہے۔

اگلے دن صبح ہی سے واشنگٹن کی سڑکوں پر ماتمی دھنیں بجنے لگیں اور گاہے گاہے الوداعی سلامی کی توپوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور اس طرح شام تک جنرل ہیریسن کی تدفین کی رسومات اختتام کو پہنچیں ۔ شام کو ہم لوگ دارالحکومت (واشنگٹن) کی سڑکوں کی سیر کرتے رہے۔ رات کے وقت میرے دونوں دوست

مجھے مختلف شراب خانوں میں لئے پھرے انہوں نے خوب خوب جام لنڈھائے اور مجھے بھی پیش کرتے رہے۔ میں نے اس احتیاط کے ساتھ صرف چند پیگ پئے کہ ہوش حواس قائم رہیں لیکن آخری جام کے بعد مجھے انتہائی ناگواری سی محسوس ہوئی اور طبیعت بگڑنے لگی۔ کھانے کی میز پر مجھے قطعی بھوک نہ تھی بلکہ کھانے کی مہک کے ساتھ ہی ابکائیاں آنے لگیں۔ براؤن اور ہملٹن نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا تاکہ صبح روانگی سے پہلے میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں۔ اپنے کمرے آکر میں نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا لیکن دردِ سر کی شدت سے نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ آدھی رات کے وقت پیاس کا اتنا غلبہ ہوا کہ میں اپنے کمرے سے باہر پانی کی تلاش میں نکلا جہاں دو تین ملازمین مل گئے۔ اُن میں سے ایک نے پانی مہیا کر دیا۔ دو گلاس پانی پینے کے بعد جب میں واپس کمرے میں داخل ہوا تو ایک بار پھر پیاس اور اعصاب شکن دردِ سر نے مجھے نیم مردہ اور نیم پاگل بنا دیا۔ اُس رات کی اذیت اور ہولناکی مجھے قبر تک یاد رہے گی۔ درد کی شدت اور نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے کمرے میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔ اُس آواز کے ساتھ ہی میں غیر شعوری طور پر نیم بے ہوشی کے عالم میں ہوٹل سے نکل کر سڑک تک آگیا۔ اس کے بعد کا مجھے علم نہیں کہ کتنی دیر تک چلتا رہا اور کب بے دم اور بے ہوش ہوا اور کتنے دن اس حالت میں رہا لیکن جب ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو مہیب تاریکی کے عالم میں تنہا زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا۔ سر کا درد تو ختم ہو گیا تھا لیکن کمزوری سے نیم غشی کی کیفیت طاری تھی۔ میرے جسم سے کوٹ اور ہیٹ اُتارے جا چکے تھے اور میں ایک چھوٹی بنچ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ دونوں ہاتھ

ہتھکڑی میں بندھے تھے اور پیروں میں بھاری بیڑیاں پڑی تھیں۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کہاں ہوں، براؤن اور ہملٹن کہاں ہیں، ان زنجیروں اور ہتھکڑی بیڑی کا کیا مطلب ہے اور مجھے کس جرم میں اس اندھیرے مقام پر قید کیا گیا ہے۔ مہیب تاریکی اور تنہائی کے ماحول میں سوائے میری زنجیروں کی جھنجھناہٹ کے کوئی آواز نہ تھی۔ ایک بار میں نے زور سے چیخ کر کچھ کہا لیکن سوائے اپنی آواز کی گونج کے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ خیال ہوا کہ شاید مجھے اغوا کر لیا گیا ہے ساتھ یہ گمان ہوا کہ یہ کیفیت کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ میں ریاست نیویارک کا ایک آزاد شہری ہوں جس نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ جتنا میں غور کرتا اتنا ہی پریشانی بڑھتی۔ اس عالم میں مجھے اپنی بیوی بچوں کا خیال آیا کہ جانے اب میں ان کو کیونکر دیکھ سکوں گا۔ اسی کیفیت میں ایک بار میں نے اپنا سر ہتھکڑیوں پر رکھ دیا اور خدا کے حضور فریاد کرنے اور پھوٹ پھوٹ کر آنسو بہانے لگا۔

۳

تقریباً تین گھنٹے اسی عالم میں گزر گئے پھر مرغوں کی بانگ اور دور سے گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں آنے لگیں جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ صبح ہو چکی ہے، لیکن میرے تاریک قید خانے میں روشنی کی چھوٹی سی کرن بھی نمودار نہیں ہوئی البتہ کمرے کی چھت پر قدموں کی دھمک اور کمرے میں موجود سیلن اور بدبو سے میں نے اندازہ کر لیا کہ مجھے کسی مکان کے تاریک تہہ خانے میں محبوس کیا گیا ہے۔ کم و بیش ایک گھنٹے بعد قریب سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر تالہ کھلنے کی آواز کے ساتھ یکبارگی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ میں نے نظریں اُٹھائیں تو دو آدمی میرے سامنے کھڑے تھے اُن میں سے ایک شخص ادھیڑ عمر لیکن لمبا چوڑا اور خاصا تنومند تھا۔ اُس کے چہرے سے بے رحمی، بدخوئی اور عیاری صاف عیاں تھی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ واشنگٹن کا رسوائے زمانہ غلاموں کا تاجر جیمز برچ تھا۔ دوسرا شخص اُسی کا کارندہ اور خوشامدی چمچہ ریڈ برن تھا۔ روشنی ہونے پر میں

نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ پتھروں کی چار دیواری سے گھری تقریباً بارہ مربع فٹ کی ایک کوٹھری تھی جس میں لوہے کی سلاخوں والی چھوٹی سی کھڑکی اور دروازہ تھا۔ کوٹھری میں اِس بنچ کے علاوہ کچھ نہ تھا جس پر مجھے باندھ کر بٹھایا گیا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کوٹھڑی واشنگٹن میں ولیم کے بدنام زمانہ غلاموں کے باڑے کا حصہ تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک آزاد اور جمہوری ملک کہلانے والے امریکہ کے عین دارالحکومت میں غلاموں کے یہ باڑے آزادی اور جمہوریت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ اور ناسور کا درجہ رکھتے ہیں۔

''ہاں بھئی ! اب تمہارا کیا حال ہے؟'' برچ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ میں بیمار ہوں اور ساتھ ہی اپنے قید کئے جانے کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں اس نے بتایا کہ اس نے مجھے ایک غلام کی حیثیت سے خریدا ہے اور جلد ہی مجھے نیو آرلین بھیج دیا جائے گا۔ میں نے آواز بلند کرتے ہوئے جرأت کے ساتھ اسے بتایا کہ میں سراٹوگا کا ایک آزاد فرد ہوں۔ وہاں میرے بیوی بچے بھی آزاد شہری ہیں اور وہ میرے منتظر ہوں گے۔ پھر میں نے اِس حالت پر سخت احتجاج کیا جس میں کہ مجھے رکھا گیا تھا۔ اُس نے میری بات کو یکسر نظر انداز کر کے گالیوں ایک بوچھاڑ کے ساتھ مجھے جھوٹا قرار دیا اور مجھے جارجیا سے بھاگا ہوا سیاہ فام غلام بتایا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی بات کو غلط قرار دیتے اور چلاتے ہوئے کہا کہ یہ سراسر ظلم ہے اور میں اِس جگہ سے نکل کر ان سب کے خلاف مناسب کاروائی کروں گا جنھوں نے مجھے قید و بند کی اس حالت تک پہنچایا ہے۔ یہ سن کر برچ غصے سے بھڑک اُٹھا اور ریڈ برن کو دُرّہ لانے کا حکم دیا۔ برن نے فوراً تعمیل کی۔ میں نے دیکھا کہ

اُس دُرّے میں چمڑے کے نو لچکدار پہلو ہیں۔ دونوں نے پہلے تو مجھے دبوچ کر میرے کپڑے اُتار دیئے اور پھر ٹکٹکی کے ساتھ میرے سر کو جھکا کر مضبوط رسّے سے باندھ دیا پھر برچ نے پوری طاقت سے میرے برہنہ جسم پر کوڑے برسانے شروع کر دیئے۔ مارتے مارتے تھک کر ایک بار اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اب بھی میں اپنے کو ایک آزاد انسان کہنے پر بضد ہوں۔ میں نے کہا کہ بیشک میں خود کو غلام سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ سنتے ہی اُس نے ایک بار پھر پوری قوت کے ساتھ تازیانے لگانے شروع کر دیئے۔ ہر بار تھک جانے پر وہ رُک کر مجھ سے یہی سوال کرتا لیکن میرا جواب سنتے ہی انتہائی شرمناک گالیوں کے ساتھ وہ پھر اپنا تشدد جاری کر دیتا۔ میں نے رحم کی درخواست کی لیکن اس کا جواب مجھے دُرّوں کی ضربوں کی صورت میں دیا گیا۔ آخر کار میرا پورا جسم جگہ جگہ سے پھٹنے لگا اور پورا وجود انگاروں پر رکھا ہوا محسوس ہوا۔ اب اُس کے سوال پر میں نے بالکل خاموشی اختیار کر لی لیکن اس نے اپنی ظالمانہ کاروائی میں کوئی کمی نہ کی یہاں تک کہ ریڈبرن نے کہا کہ اب اِس پر مزید کوڑے برسانا بیکار ہوگا کیونکہ اس کا جسم جابجا پھٹ چکا ہے۔ یہ سن کر برچ نے مشقِ ستم بند کرتے ہوئے کہا کہ اب اگر میں نے خود کو آزاد انسان یا اغوا شدہ فرد کہا تو وہ مجھے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ پھر انہوں نے میری ہتھکڑی تو اُتار دی لیکن بیڑیاں بندھی رہنے دیں اور کھڑکی اور دروازے مقفل کرتے ہوئے باہر نکل گئے اور میں تنگ و تاریک کوٹھری میں تنہا رہ گیا۔

تقریباً دو گھنٹے گزرنے کے بعد ایک بار پھر تالہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں خوف سے کانپ گیا لیکن اس بار برن اکیلا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک روٹی،

تلے ہوئے گوشت کا ایک ٹکڑا اور ایک گلاس پانی تھا۔ اُس نے میرا حال پوچھا اور ہمدردانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ اب اپنے حقوق اور حیثیت کے بارے میں میرا برچ سے کچھ کہنا بیکار ہو گا اور اس کا نتیجہ بے رحمانہ تشدد کے سوا کچھ نہ نکلے گا۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے پیر بیڑیوں سے آزاد کر دیئے، کھڑکی کھول دی اور کوٹھری مقفل کر کے چلا گیا۔ شام ہوتے ہوتے میرے جسم پر ورم آ چکا تھا اور درد کی شدت سے پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ رات کو مجھے بغیر تکیہ اور چادر کوٹھری کے سرد اور سیلن زدہ فرش پر ہی لیٹنا پڑا۔ اِسی عالم میں کئی دن گزر گئے۔ دن میں دو مرتبہ برن ایک روٹی، ایک گوشت کا ٹکڑا اور پانی کا ایک گلاس رکھ جاتا لیکن میری بھوک اُڑ چکی تھی۔ میرے جسم کے زخم مجھے کسی کروٹ چین نہ لینے دیتے۔ سوتے جاگتے ہر وقت اپنی موجودہ صورتِ حال اور بیوی بچوں کی جدائی کا خیال کر کے کبھی تو میں بے اختیار رونے لگتا، کبھی یہ گمان کرتا کہ براؤن اور ہملٹن نے مجھ سے دغا کی، کبھی امید بندھتی کہ آخر برچ کو ایک دن یقین آ جائے گا کہ میں جارجیا سے بھاگا ہوا غلام نہیں ہوں اور وہ مجھے آزاد کر دے گا لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ آدمی کمینگی اور لالچ میں کس حد تک انسانیت کے درجے سے گر سکتا ہے۔ چند دن بعد مجھے اپنی کوٹھری سے صحن تک جانے کی اجازت مل گئی۔ یہاں میں نے تین غلاموں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک تو محض دس سالہ لڑکا تھا جبکہ دوسرے دونوں بیس اور پچیس برس کے نوجوان تھے۔ بڑے کا نام کلمن رے تھا جسے برچ نے چند روز قبل ہی خریدا تھا۔ سیاہ رنگت کا یہ نوجوان اپنے بشرے سے ذہین اور سوجھ بوجھ والا لگتا تھا۔ جب میں نے اُسے اپنی رودادِ غم سنائی تو اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ برچ کے ظالمانہ سلوک کے پیشِ نظر مجھے

دوسرے نوجوان کا نام ولیم تھا جسے برچ نے ورجینیا سے اپنے قرض کے عوض اُٹھوالیا تھا۔ چھوٹے لڑکے کا نام رینڈل تھا۔ وہ بہت ہی معصوم اور قید و بند کے معاملات سے مطلق بے خبر تھا۔ کبھی وہ اپنی ماں کو یاد کر کے رونے لگتا اور کبھی بھولی بھالی باتوں اور شرارتوں سے ہم سب کو ہنسا دیتا تھا۔

چند دن گزرنے کے بعد ہمیں ایک ایک ایسا کمبل دیا گیا جو سردیوں میں گھوڑوں پر ڈالنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ میری غلامی کے تمام عرصے کے دوران میرا بستر اسی قسم کے کمبل پر مشتمل رہا۔ غلاموں کے اس باڑے میں مجھے تقریباً دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ ایک رات وہاں ایک عورت لائی گئی۔ اُس نے ایک چھوٹی سی بچی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور بُری طرح رو رہی تھی۔ اس عورت کو دیکھتے ہی رینڈل کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ کبھی عورت سے چمٹتا کبھی بچی کو چومتا۔ عورت بھی آنسو بہاتے ہوئے رینڈل کو گلے لگاتی رہی۔ معلوم ہوا کہ وہ رینڈل کی ماں ایلیزا ہے اور بچی جس کا نام ایمی ہے، رینڈل کی سوتیلی بہن ہے۔ ایمی سات آٹھ سال کی بہت ہی پیاری اور خوبصورت سی بچی تھی۔ اُس کے گھونگریالے بال اس کے کاندھوں پر جھول رہے تھے اور اس کی صحت اور لباس کی خوبصورتی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوشحال گھرانے میں پلی بڑھی ہے۔ ایلیزا بھی نہایت قیمتی ریشمی لباس اور سونے کے زیورات سے مزین تھی اور اپنے لہجے اور زبان غرض کسی صورت میں بھی اُس کا غلام خاندان سے تعلق معلوم نہ ہوتا تھا۔ مقدر کی خرابی نے اسے اچانک اِس حال میں لا ڈالا تھا۔

کوٹھری میں پہنچتے ہی اُس نے خود کو زمین میں گرا دیا دونوں بچوں کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ کبھی وہ انہیں پیار کرتی، اور کبھی لوریاں سناتی، تھوڑی دیر میں

انہیں مامتا کی پُرسکون آغوش میں نیند آ گئی اب ایلیز ا نے انتہائی درد انگیز لہجے میں ایسی فریاد شروع کی کہ سننے والوں کے دل ہل گئے۔ وہ کہہ رہی تھی "آہ! میرے اِن پیارے بچوں کو کیا خبر کہ وہ جلد ہی مجھ سے جدا کر دیئے جائیں گے، اِن سے مامتا کا سایہ ہمیشہ کے لئے چھن جائے گا، اِن کی ناز برداریاں کون کرے گا اور میں خود رینڈل اور ایمی کے بغیر کیسے زندہ رہ سکوں گی۔" دراصل اسے معلوم ہو چکا تھا کہ جلد ہی اسے اور اُس کے بچوں کو الگ الگ منڈیوں میں فروخت کیا جائے گا۔

۴

اگلے دن آدھی رات کے وقت برچ اور ریڈ برن نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور گالیاں دیتے ہوئے فوراً اسٹیمر کے سفر کیلئے تیار ہونے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی اس نے سوئے ہوئے بچوں کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ پہلے ہم لوگوں کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں پھر رے اور مجھ پر سامان کے صندوق لادے گئے اور رات کے اندھیرے میں عظیم جمہوری ملک کے دارالحکومت کی سڑکوں سے اِس طرح گزارا گیا کہ آگے برچ چل رہا تھا جس کے ہاتھ میں ہماری زنجیریں تھیں اور پیچھے پیچھے برن ایک موٹے سے ڈنڈے کے ساتھ ہمیں جانوروں کی طرح ہنکار رہا تھا۔ ساحل پر ایک اسٹیمر لنگر انداز تھا۔ ہمیں اُس پر سامان لادنے اور سوار ہونے کا حکم ملا۔ جلد ہی اسٹیمر روانہ ہو گیا لیکن ہم لوگ منزل سے یکسر بے خبر تھے۔ اُس رات سوائے رینڈل اور ایمی کے کوئی نہ سویا کلم رے کی کیفیت بھی انتہائی کربناک تھی۔ وہ

ہم عمر دوستوں اور عزیزوں سے ہمیشہ کے لئے دور لے جایا جا رہا تھا۔ وہ اور ایلیزا آہوں اور آنسوؤں میں ڈوبے اپنے مقدر کو کوس رہے تھے اور میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اِن ظالموں کے چنگل سے فرار کے منصوبے بنا رہا تھا ساتھ ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ ان کے سامنے اپنی آزادی کا ذکر ہرگز نہ کروں گا۔

صبح ہوئی تو ہمیں اسٹیمر کے عرشے پر ناشتے کے لئے بلایا گیا۔ برچ نے ہماری ہتھکڑیاں کھولیں۔ جب ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تو اس نے صرف ایلیزا کو شراب پیش کرنا چاہا لیکن اِس نے بھی شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ ناشتے کے بعد ہمیں پھر ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں اور ایک قطار میں سامان کے صندوق پر اس طرح بٹھا دیا گیا کہ برچ اور اُس کے ساتھیوں کی نظریں مستقل ہم پر رہیں۔ ہمارے سامنے ایک خوشگوار صبح کا منظر تھا پرندے آزاد فضا میں پرواز کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں بھی ایک پرندہ ہوتا تا کہ اُن فضاؤں کی طرف پرواز کر جاتا جہاں میرے مولے نجانے کس عالم میں انتظار کر رہے ہوں گے۔

سہ پہر کے قریب اسٹیمر ایک موضع کے قریب رُکا تو برچ اور اُس کے پانچ غلام کنارے پر اُترے۔ انہوں نے بچوں کو ایک ڈبل روٹی خرید کر دی ساتھ ہی برچ مجھ سے غصے کے ساتھ مخاطب ہو کر بولا کہ تم اپنا موڈ ٹھیک رکھو اور زیادہ مظلومیت طاری نہ کرو ورنہ اچھی طرح خبر لی جائے گی۔

فریڈرک برگ پہنچ کر ہمیں اسٹیمر سے اُتر کر ایک وین میں سوار ہونے کا حکم ملا۔ وین نے ہم سب کو اندھیرے سے پہلے ریاست ورجینیا کے شہر رچمنڈ پہنچا دیا۔ رچمنڈ میں ریلوے اسٹیشن اور دریا کے درمیان واقع غلاموں کے ایک

باڑے میں ہمیں ٹھہرایا گیا جس کا مالک گوڈن نامی ایک شخص تھا۔ اس باڑے کی حالت واشنگٹن والے باڑے سے مختلف نہ تھی البتہ اس کے دونوں سروں پر دو بڑے کمرے تھے جہاں غلاموں کے خریدار اُن کا معائنہ کر کے انہیں پسند کرتے اور سودے طے کرتے تھے۔ بالکل اُسی طرح جیسے گھوڑوں گدھوں کے خریدار کرتے ہیں۔ گوڈن تقریباً پچاس سالہ سیاہ رنگت انسان تھا۔ برچ اور گوڈن جس جوش وخروش کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دونوں بڑے پرانے دوست ہیں۔ برچ نے جہاز کی روانگی کا وقت معلوم کیا تو گوڈن نے بتایا کہ جہاز اگلے دن بندرگاہ چھوڑے گا۔ گوڈن نے ایک تجربے کار کاروباری انسان کی طرح میرے شانوں اور گردن کو ٹٹول کر میری قیمت کا اندازہ لگایا پھر مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نیویارک کا نام نکل گیا جس پر گوڈن حیران ہوا اور برچ نے غضبناک نظروں سے مجھے گھورا میں نے فوراً وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں ایک ضروری کام سے نیو یارک بھیجا گیا تھا یعنی میں نے یہ تاثر دیا کہ میں نہ تو نیویارک کا رہنے والا ہوں نہ ہی کبھی میری آزاد انسان کی حیثیت تھی۔ میرے بعد وہ کلم، ایلیزا اور اس کے بچوں کی طرف متوجہ ہوا اور اُن سے بھی مختلف سوالات کئے۔ ہمیں ایک کھلے صحن میں لایا گیا جہاں تقریباً تیس غلام مرد عورتیں اور موجود تھے۔ اُن میں کچھ بینچ پر بیٹھے تھے اور کچھ گھوم پھر رہے تھے۔ اُن کے لباس صاف ستھرے تھے جبکہ مردوں نے ہیٹ اور عورتوں نے اسکارف باندھ رکھے تھے۔ برچ اور گوڈن ہم سے کچھ فاصلے پر صحن میں ایک بنچ پر بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے جو ہم نہ سن سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں برچ مجھے اشارے سے بلا کر کمرے میں لے گیا اور کہا کہ اچھا تو تم

نے گوڈن کو بتا دیا کہ تم نیویارک سے آئے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے یہ نہیں بتایا کہ میرا تعلق نیویارک سے ہے یا میں ایک آزاد شہری ہوں اور نہ میں ایسا کبھی کسی کو بتاؤں گا۔ اُس نے کہا کہ بہر حال کان کھول کر سن لو کہ اگر تم آئندہ نیو یارک کا لفظ زبان پر لائے یا اپنی آزادی کا نام لیا تو میں تمہاری موت ثابت ہوں گا۔ واپس صحن میں آئے تو سب قیدیوں کے ساتھ مجھے بھی کھانا دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے ایک زرد رُو، طویل القامت اور بھاری جثے والے شخص کے ساتھ ایک ہی ہتھکڑی میں ڈال دیا گیا۔ اس شخص کا نام رابرٹ تھا وہ شہر سنسناٹی کا ایک آزاد شہری تھا جس کی بیوی اور دو بچے بھی تھے۔ اُسے بھی بالکل میری طرح دو آدمی ملازمت کے بہانے کسی جنوبی ریاست لے آئے اور پھر قیدِ تنہائی میں سخت تشدد کے بعد زبان بندی پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ رات ہونے پر رابرٹ، کلم، ایلیزا، اُس کے بچوں کے مجھے ایک کوٹھری میں لایا گیا جہاں چار اشخاص پہلے سے موجود تھے۔ اُن میں ایک میاں بیوی ڈیوڈ اور کیرولینا تھے جن کو بطور غلام بکنے سے بڑھ کر یہ پریشانی تھی کہ اب انہیں ایک دوسرے سے جدا کر کے الگ الگ مالکوں کے پاس فروخت کر دیا جائے گا اور دو نوجوان نیگرو لڑکیاں تھیں اُن میں ایک شادی شدہ تھی جس کا شوہر الگ فروخت کیا جا چکا تھا اور وہ خود اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر انتہائی گندے الفاظ میں بردہ فروشوں کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ صبح ہونے پر گوڈن نے اپنی نگرانی میں ہم سے پورے احاطے کی صفائی کرائی۔ کلم رے کو بتایا گیا کہ اُسے ہم لوگوں کے ساتھ نہیں جانا بلکہ برچ کے ساتھ واشنگٹن واپس جانا ہو گا۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ میں نے اسے الوداع کیا اور پھر ہم دونوں کبھی نہیں مل سکے۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ جلد ہی وہ برچ کی قید

سے فرار ہو کر کینیڈا بھاگ گیا تھا جہاں میرے سالے کے گھر ایک رات قیام کے دوران اس نے میری صورتِ حال کے بارے میں میرے خاندان کو مفصل طور پر بتا دیا تھا۔

سہ پہر کے وقت ہمیں رچمنڈ کی سڑکوں پر کشاں کشاں چلاتے ہوئے اِس حال میں بندرگاہ لایا گیا کہ میں اور رابرٹ ایک ہی ہتھکڑی میں بندھے ہوئے تھے۔ شام پانچ بجے ہم لوگ برگ آرلینز نامی جہاز پر سوار ہوئے جس پر زیادہ تر تمباکو لدی ہوئی تھی۔ ادھر رچمنڈ سے جہاز کی روانگی پر برچ نے کلم کو ساتھ لے کر واشنگٹن واپسی کا سفر شروع کیا۔

دراصل برچ جنوبی ریاستوں کا ایک بدنام بَردہ فروش تھا جو مردوں اور عورتوں کو بہت کم قیمت پر خرید کر باڑوں میں قید رکھتا اور پھر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتا۔ اگلے بارہ سال کے عرصے میں، میں نے اُسے نہیں دیکھا پھر اِسی سال میری اس کی ملاقات ایک جلاد صفت انسان اور ایک غلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مجرم قیدی اور آزاد شہری کے طور پر عدالتِ انصاف میں ہوئی۔

۵

رات ہوتے ہوتے ہمارے جہاز، برگ آرلینز نے لنگر اُٹھایا اور پھر نارفاک کے شہر میں پہنچ کر لنگر انداز ہوا۔ بندرگاہ سے کشتی کے ذریعے مزید چار غلاموں کو جہاز پر سوار کرایا گیا۔ اُن میں اٹھارہ بیس سال کے دو نوجوان لڑکے فریڈرک اور ہنری اور ایک نوجوان سیاہ فام لڑکی ماریا تھی جسے اپنے حسن پر اتنا ناز اور اعتماد تھا کہ اُس نے جہاز پر آتے ہی سب ساتھیوں کو بتا دیا کہ نیو آرلینز پہنچتے ہی کوئی مالدار اور صاحب ذوق آدمی اُسے خرید لے گا اور اُس کی بقیہ زندگی عیش و عشرت میں گزرے گی۔ البتہ چوتھا شخص جس کا نام آرتھر تھا سوار ہونے میں بہت مزاحمت کر رہا تھا۔ اسے گھسیٹ کر سوار کرایا گیا جس کے دوران وہ بلند آواز سے احتجاج کرتے ہوئے رہائی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کشمکش میں اُس کا چہرہ زخمی ہو چکا تھا۔ اُس کو جہاز پر چڑھا کر فوراً سب سے نچلی منزل میں دھکیل دیا گیا۔ آرتھر

کی کہانی مجھ سے زیادہ مختلف نہ تھی وہ اِسی شہر نارفاک میں ایک آزاد شہری کے طور پر راج مستری کا کام کرتا تھا اور اپنے چھوٹے سے خاندان کا واحد کفیل تھا۔ کچھ ہی عرصے پہلے ایک دن زیادہ کام کے باعث گھر واپسی میں بہت رات ہو گئی۔ مضافاتی بستی سے پہلے ایک ویران سڑک پر گزرتے ہوئے بَردہ فروشوں کے ایک گروہ نے اُسے گھیر کر اتنا تشدد کیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا پھر اُسے غلاموں کے ایک باڑے میں کچھ عرصہ رکھ کر آج برگ آرلینز پر سوار کر دیا گیا تا کہ کسی اگلی منزل پر بطور غلام فروخت کر دیا جائے۔

نارفاک سے جہاز نے لنگر اُٹھایا تو ہم سب کی ہتھکڑیاں اُتار دی گئیں اور دن کے وقت عرشے پر آنے جانے کی اجازت مل گئی۔ رابرٹ کو کپتان کا اردلی مقرر کیا گیا، مجھے باورچی خانے کا انتظام اور کھانے پانی کی تقسیم کے شعبے پر لگا دیا گیا اور اس کام کے لئے جم، کفی اور جینی کو میرے ماتحت کے طور پر ڈیوٹی دی گئی۔ اب اُن تینوں کو باورچی اور مجھے اسٹیورڈ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

غلاموں کو دن میں دو بار یعنی صبح دس بجے اور شام پانچ بجے کھانا ملتا تھا۔ کھانا کیا تھا، گوشت کا ایک ٹکڑا اور چھوٹی سی خشک ڈبل روٹی ہر شخص کے ہاتھ میں پکڑا دی جاتی۔ پلیٹ یا چھری کانٹے کا تکلف قطعی بے معنی سمجھا جاتا البتہ بعد میں ایک کافی کی پیالی ملتی رات ہونے پر ہمیں جہاز کے سب سے نچلے حصے میں لے جا کر بند کر دیا جاتا۔

ایک دن شام کے وقت آرتھر اور میں عرشے کے اگلے حصے پر مستول کے قریب بیٹھے ہوئے اپنے تاریک مستقبل اور آئندہ کے ممکنہ ہولناک شدائد کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ آنے

والے دنوں میں ہمیں سخت اذیتوں اور مصائب کا سامنا ہوگا۔ بہت دیر تک ہم کبھی اپنے ماضی اور کبھی بیوی بچوں اور کبھی فرار کے طریقوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم میں سے ایک دور کی کوڑی لایا کہ کیوں نہ ہم جہاز پر قبضہ کر کے اس کا کنٹرول سنبھال لیں اور اس کا رُخ نیویارک کی بندرگاہ کی طرف موڑ دیں۔ ہم دیر تک تجویز کے حق میں اور مخالفت میں باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ مجھے تھوڑا بہت قطب نما کے استعمال کا طریقہ معلوم تھا، لیکن تجویز کی راہ میں حائل خطرات پر غور کر کے ہمارے حوصلے پست ہو گئے۔ سب سے بڑا مسئلہ جہاز کے عملے اور غلاموں میں سے کچھ کو اعتماد لے کر اُن پر بھروسہ کرنا تھا۔ ہم دونوں اکثر رات کی تنہائی میں اس منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے اور دشواریوں کو دور کرنے کے طریقے سوچتے۔ سب سے پہلے ہم نے رابرٹ کو اپنا ہمراز بنایا۔ اُس نے ہماری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے دل وجان سے سازش کو کامیاب بنانے میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ کافی محنت کے بعد ہم تینوں اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی مزید کسی اور شخص کو راز میں شریک کرنا اور اعتماد کرنا بہت خطرناک ہوگا کیونکہ خوف اور نادانی میں ہر شخص کے لئے فرار کے اس منصوبے کو راز میں رکھنا بہت دشوار ہوگا۔ لہٰذا ہم تینوں ہی نے اس پُر خطر مہم کی ذمہ داری اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا رات کے وقت ہم سب غلاموں کو جہاز کے تہہ خانے میں دھکیل کر بند کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے سب سے پہلا اور بڑا مرحلہ تو واردات کی رات عرشے تک پہنچنے کا تھا۔ میں جہاز کے مستول کے ساتھ لٹکی ہوئی ایک کشتی دیکھ چکا تھا۔ سوچ سوچ کر ہم تینوں نے شام کے کھانے اور رات ہونے

کے درمیان اس کشتی میں چھپ جانے کا منصوبہ بنایا کیونکہ اُس وقت تمام غلاموں
کو جلدی میں بغیر گنتی کے تہہ خانے کی طرف بھگا دیا جاتا تھا۔ جہاز کا کپتان اور
نائب کپتان رات کے وقت ایک ہی کیبن میں سوتے تھے۔ اردلی کے فرائض
انجام دیتے ہوئے رابرٹ نے دونوں کے بستروں کی پوزیشن تک سے آگاہی
حاصل کر لی تھی اور یہ بھی پتہ چلا لیا تھا کہ دونوں بستروں کے درمیانی میز پر دو
پستول اور خنجر رکھے ہوتے ہیں۔ باورچی عرشے کی گیلری میں سوتا تھا جبکہ چھ
مددگار ملاح رسوں سے تنے ہوئے ترپال پر نیند اور بیداری کے درمیان رات
گزارتے تھے۔ منصوبے کے مطابق مجھے اور آرتھر کو نصف شب کے بعد کپتان
کے کیبن میں داخل ہونا تھا اور سب سے پہلے پستول اور خنجر پر قبضہ کر کے دونوں کو
موت کے گھاٹ اُتارنا تھا۔ نائب کپتان کا نام بڈی تھا اور کپتان جس کا نام اب
مجھے یاد نہیں چھوٹے قد کا باحوصلہ، پُر اعتماد اور مہذب انسان معلوم ہوتا تھا۔
رابرٹ کو ایک موٹا ڈنڈا لے کر کیبن کے دروازے پر کھڑا ہونا تھا تاکہ اگر کوئی
ملاح اتفاقی طور ادھر آ نکلے تو وہ اُس سے نمٹے، حملہ اتنا اچانک ہونا تھا کہ کسی کو ہلنے
یا مزاحمت کا موقع ہی نہ مل سکے۔ عرشے اور کپتان کے کیبن کے درمیانی راستے کو
آپریشن کی کامیابی تک بند رکھنا تھا ورنہ غلام قیدی بیدار ہو کر سراسیمگی کی صورت
میں پریشانی کا سبب بن سکتے تھے۔ کپتان اور نائب کپتان کے خاتمے کے بعد
آرتھر اور رابرٹ کے لئے ملاحوں پر پستولوں اور خنجر کی مدد سے قابو پا لینا دشوار نہ تھا
جبکہ مجھے پائلٹ کا چارج سنبھال کر اور جہاز کو شمال کی جانب موڑ دینا تھا، اِس
دعا اور امید کے ساتھ کہ کوئی موافق ہوا آزاد سرزمین کی طرف تیزی سے جانے
میں مددگار ہو۔ اس طرح ہم آزادی یا موت میں سے ایک چیز کے حصول کے

لئے اس منصوبے دل وجان سے عمل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن ہماری قسمت میں تو طویل غلامی لکھی جا چکی تھی۔ منصوبے کے مقررہ دن سے صرف دو دن پہلے ہم ایک المناک واقعہ سے دوچار ہو گئے یعنی رابرٹ پر چیچک کا شدید حملہ ہوا اور اس کی حالت بہت تیزی سے بگڑتی چلی گئی، یہاں تک کہ نیو آرلین پہنچنے سے چار دن قبل ہی رابرٹ انتقال کر گیا۔ اُس کی لاش کو ایک کمبل میں لپیٹ کر ایک بھاری پتھر سے باندھ کر سمندر کی تہہ میں اُتار دیا گیا۔ چیچک پھیلنے کی دہشت اور رابرٹ کی جُدائی نے ہمارے آزادی کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا اور اس طرح آرتھر اور میں ایک بار پھر غم واندوہ کا شکار ہو گئے۔

رابرٹ کی موت کے دو تین دن بعد ایک اُداس شام میں جہاز کے اگلے حصے کے قریب یاس کے عالم میں کھڑا تھا کہ ایک ملاح نے میری کیفیت سے متاثر ہو کر نہایت ہمدردی اور اپنائیت سے میری اُداسی کا سبب معلوم کرنا چاہا۔ میں نے اس کو بے ضرر اور ہمدرد پا کر اپنے اغواء اور غلامی کی داستان بیان کر دی۔ اس نے ملاحوں کی سادہ سی زبان میں نہ صرف مجھ سے ہمدردی کی بلکہ میری ہر ممکن مدد کی قسم کھائی۔ اُس نیک دل برطانوی نژاد ملاح کا نام میننگ تھا۔ میں نے اُس سے درخواست کی کہ مجھے کسی طرح چوری چھپے قلم دوات اور کاغذ مہیا کر دے تاکہ میں اپنی حالتِ زار کے بارے میں اپنے کسی عزیز دوست کو خط کے ذریعے آگاہ کر سکوں۔ اس نے اگلے دن مجھے وہ چیزیں لا دیں اور بتایا کہ جہاز بہت جلد دریائے مسی سپی کے قریب سے گزرتا ہوا نیو آرلین پہنچ جائے گا لہٰذا خط لکھنے میں جلدی کرنا چاہیے۔ شام کے وقت میں عرشے پر موجود کشتی میں چھپ گیا اور رات ہونے پر انتہائی کم روشنی میں ہنری نارتھپ کے نام خط لکھا جس میں اغوا،

اور قید اور غلامی کی تمام رُوداد اور جہاز کا نام بیان کرتے ہوئے مدد کی درخواست کی اور صبح کو لفافہ میتگ کے حوالے کر دیا۔ دو دن بعد ہی جب جہاز کنارے کے ساتھ سست روی سے گزر رہا تھا میں نے دیکھا کہ میتگ نے خشکی پر چھلانگ لگائی اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گیا اور مجھے اشارہ سے سمجھایا کہ خط پوسٹ کیا جا چکا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ خط سینڈی ہل میں ہنری نارتھپ کو مل گیا تھا اور اس نے گورنر کو کاروائی کے لئے پہنچا دیا تھا لیکن چونکہ گورنر کو خط ملنے تک کافی وقت گزر چکا تھا اور اس میں جہاز کی منزلِ مقصود کا ذکر بھی نہ تھا لہٰذا اس پر کوئی موثر کاروائی نہ ہو سکی۔ شاید میرے مقدر میں بارہ سالہ غلامی لکھی جا چکی تھی۔

جونہی جہاز خشکی پر لگا میں نے دیکھا کہ دو آدمی تیزی سے آرتھر کو پوچھتے ہوئے داخل ہوئے۔ آرتھر کی نظر اُن پر پڑی تو وہ خوشی سے دیوانہ وار اُن سے لپٹ گیا۔ شاید وہ دونوں آرتھر کے گہرے دوست تھے اور پتہ چلا کہ وہ نارفاک سے آرتھر کی رہائی کی خوشخبری لے کر آ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آرتھر کے اغواء کرنے والے گرفتار ہو کر نارفاک کی جیل میں بند کئے جا چکے ہیں انہوں نے کپتان کو کچھ کاغذات دکھائے اور چند منٹ گفتگو کے بعد خوشی سے سرشار آرتھر کو لے کر روانہ ہو گئے۔

بہرحال ساحل پر موجود مجمع میں سے کسی نے بھی میری طرف توجہ نہ کی اور نہ ہی کوئی آشنا چہرہ مجھے دکھائی دیا۔ میں انتہائی یاس کے عالم میں سوچنے لگا کہ آرتھر تو جلد ہی اپنے خاندان کے درمیان پہنچ جائے گا اور اپنے دشمنوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر اطمینان کا سانس لے گا، لیکن کیا میں بھی کبھی اپنے بال بچوں کو دیکھ سکوں گا یا مجھے بھی ایک دن رابرٹ کی طرح سمندر کی تہہ میں اُتار دیا

جائے گا۔

اِسی دوران غلاموں کے تاجر اور بیوپاری جہاز پر آنے لگے۔ان میں سے ایک لمبا تڑنگا شخص اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے برچ کے بھیجے غلاموں کا دستہ وصول کرنا تھا جس میں ایلیزا اُس کے بچے ہیری ایمی، میں اور چند وہ غلام شامل تھے جنہیں رچمنڈ سے سوار کرایا گیا تھا۔اس شخص کا نام تھیوفلس تھا اس نے کاغذ میں سے نام پڑھتے ہوئے پکارا ''پلیٹ'' کسی نے جواب نہ دیا تو کئی بار آواز لگائی اور جواب نہ ملنے پر پہلے اس نے باقی افراد یعنی ایلیزا، ایمی اور ہیری کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا پھر کپتان سے پوچھا کہ پلیٹ کہاں ہے جب کپتان نے اس نام سے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ اس کالے کو کسِ نے بھیجا ہے، کپتان۔نے جواب دیا ''برچ نے'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تمہارا نام پلیٹ ہے تو تم آگے کیوں نہیں آئے۔میں نے اسے بتایا کہ میرا نام پلیٹ نہیں ہے مگر مجھے اس نام سے پکارے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے'' اچھا تو میں تمہیں اس نام کا ایسا سبق دوں گا کہ تم پھر کبھی نہیں بھول سکو گے'' وہ دھمکی دینے کے انداز میں بولا اور میں سمجھ گیا کہ برچ نے مجھے اسی نام سے بیچا ہے۔غرض ہمیں جہاز سے تھیوفلس کے غلاموں کے باڑے میں پہنچا دیا گیا یہ باڑہ رچمنڈ میں گوڈن کے باڑے ہی جیسا تھا البتہ اس کی دیواریں اینٹوں کے بجائے لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی تھیں یہاں غلاموں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔رات کے قریب ہمیں کھانا دیا گیا پھر گندے سے کمبل تقسیم کئے گئے اور بغیر کسی گدے اور تکیے کے زمین پر لیٹنے کو کہا گیا۔

تھوڑی دیر میں سب لوگ سو گئے لیکن میرے دماغ میں ماضی اور حال کے واقعات تیزی سے گردش کرنے لگے کبھی تو مجھے گمان ہونے لگتا یہ میرا کوئی خوابِ پریشاں ہے............ کہ میں وطن سے ہزاروں میل دور پڑا ہوں"...... کہ مجھے ایک بے زبان جانور کی طرح سڑکوں پر کشاں کشاں پھرایا گیا...... کہ زنجیروں سے باندھ کر مجھ پر انتہائی بے رحمی سے کوڑے برسائے گئے...... کہ غلامی کا طوق ڈال کر غلاموں کے ریوڑ کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا گیا۔ لیکن جب اردگرد کا ماحول دیکھ کر یقین ہو گیا کہ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے تو میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور بے اختیار ہاتھ بارگاہِ الٰہی میں اُٹھ گئے اور رات کی ان خاموش ساعتوں میں، میں نے دعا مانگی کہ اے ٹوٹے دلوں کی فریاد سننے والے۔ اے آزاد انسانوں کے ساتھ ساتھ غلاموں کے حقیقی آقا۔ تو ہی ہم مجبور قیدیوں پر رحم کرنے والا ہے۔ آزادی کی نعمت کے ساتھ ہم سب کو ہمارے پیاروں سے ملا دے۔ انہیں تصورات میں تمام رات نیند نہ آئی یہاں تک کہ پرندے صبح کا پیغام دینے لگے۔

۶

صبح ہوتے ہی ہمیں اچھی طرح نہانے دھونے اور شیو بنانے کو کہا گیا، پھر سب کو ایک ایک نیا جوڑا دیا گیا۔ مردوں کو ہیٹ، قمیص، پتلون، جوتے اور عورتوں کو فراک جوتے اور سر پر باندھنے کے لئے رومال عطا ہوئے۔ اب ہمیں یارڈ سے متصل ہال میں لے جایا گیا تا کہ گاہکوں کی آمد سے پہلے ہمیں ضروری ہدایات دی جائیں۔ یہاں مردوں اور عورتوں کو الگ الگ اور قد و قامت کی ترتیب سے کھڑا کیا گیا۔ دن کا زیادہ حصہ تھیوفلس ہمیں، چاق و چوبند اور خوش طبع رہنے کی ہدایت دیتا رہا۔ کھانے کے وقفے کے بعد ایک دفعہ پھر اس نے اسی طرح کی مشق کروائی، پھر سب کو ناچنے کا حکم دیا اور چست و چالاک نظر آنے پر زور دیتا رہا۔ اگلے دن صبح ہی سے بہت سے گاہک تھیوفلس کے غلاموں کی نئی کھیپ کو دیکھنے آنے لگے اور وہ اُن سے ہماری خوبیاں اور خصوصیات بیان کرنے لگا۔ اکثر گاہک ہمیں چلا پھرا کر اور

جسم کے مختلف حصے ٹٹول کر پرکھتے۔ بعض گاہک ہمارا منہ کھلوا کر دانت وغیرہ دیکھتے اور کچھ آواز سننے پر زور دیتے یہ منظر بالکل چوپایوں کی منڈی جیسا تھا۔ کچھ من چلے گاہک تو عورتوں یا مردوں کو چھوٹے کمرے میں لے جا کر بالکل برہنہ کر کے زیادہ تفصیل سے ان کا معائنہ کرتے۔ ایک بوڑھے گاہک کو گاڑی بان کے طور پر غلام کی ضرورت تھی جس کے لئے اس نے مجھے پسند کیا۔ تھیوفلس نے میرے قد و کاٹھ کے علاوہ میری وائلن نوازی کو اضافی خوبی بتا کر پندرہ سو ڈالر قیمت طلب کی۔ چونکہ گاہک کا تعلق اسی شہر یعنی نیو آرلینز سے تھا اس لئے میں بھی خوش تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس شہر سے فرار ہونا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ لیکن اس قیمت پر سودا نہ ہو سکا کیونکہ بڑے میاں کے خیال میں دام مناسب نہ تھے۔ بہرحال شام تک کئی سودے ہوئے۔ ڈیوڈ اور کیرولین کے لئے سودا ایک زمیندار سے طے ہو گیا اور وہ دونوں اس کے ساتھ اس لئے خوشی خوشی چلے گئے کہ کم از کم وہ ایک دوسرے سے جدا تو نہ ہوں گے۔ لیتھ کا سودا بیٹن روج کے ایک کسان سے ہو گیا اگرچہ وہ اس سودے پر قطعی خوش نہ تھی کیونکہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا اسے اپنے نام نہاد حُسن پر بھروسہ تھا کہ کوئی امیر کبیر شخص ضرور اس طرف متوجہ ہوگا۔ لیتھ کے ساتھ ہی اس شخص نے ایلیزا کے بیٹے رینڈل کو اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھا اور پسند کر لیا لیکن اس سودے کے دوران ایلیزا مسلسل چیخ و پکار کرتی اور روتی رہی اس کا کہنا تھا کہ وہ بیٹے کو اپنے سے جُدا نہیں کر سکتی۔ وہ رو رو کر اس شخص سے درخواست کرتی رہی کہ وہ رینڈل کے ساتھ اُسے اور ایمی کو بھی خرید لے، اس نے بار بار ہاتھ جوڑ کر وعدہ کیا کہ وہ بہترین کنیز ثابت ہوگی اور خدمت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھے گی، لیکن اس آدمی نے صاف انکار کر دیا کہ وہ

تینوں کوخریدنے کی حیثیت میں نہیں ہے۔ جس پر ایلیزا شدت سے رونے اور چیخنے لگی۔ تھیوفلس یہ صورتِ حال دیکھ کر ایلیزا کی طرف کوڑا لے کر بڑھا اور حکم دیا کہ وہ فوراً خاموش ہو جائے ورنہ وہ اس پر کوڑے برسانے سے دریغ نہ کرے گا۔ یہ سن کر ایلیزا نے اپنے آنسو تو پونچھ لئے لیکن دھیمے لہجے میں گڑگڑا کر کہنے لگی کہ وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کی جُدائی کیسے برداشت کرے گی۔ وہ ایک بار پھر وفاداری، جاں سپاری اور شب و روز کی خدمت کا وعدہ کرتی رہی لیکن دو آزادوں کے درمیان سودا ہو چکا تھا۔ تھیوفلس نے ایک بار پھر ایلیزا کو بُرا بھلا کہتے ہوئے روکنا چاہا لیکن وہ دوڑ کر رینڈل سے لپٹ گئی۔ یہ ایک دل خراش منظر تھا وہ بار بار رینڈل کو بوسہ دیتے ہوئے آنسو بہا رہی تھی جبکہ رینڈل معصومیت کے ساتھ ماں کو دلاسہ دے رہا تھا کہ ہم جلد پھر مل جائیں گے حتیٰ کہ لوگ اسے لے کر ہال سے نکل گئے اور ایلیزا کی چیخیں بھی بلند نہ ہو سکیں۔

اُس رات ہمارے جہاز کے ذریعے آنے والے تمام لوگ بیمار ہو گئے۔ صبح کو جب ڈاکٹر کو بلایا گیا اور اُس نے سب کا معائنہ کیا اور سب سے پہلے مجھ پر چیچک کے حملے کی تشخیص کر دی جس پر فوری طور پر مجھے، ایلیزا، ایمی اور ہیری کو شہر کے ایک ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ مجھے اور ہیری کو ایک ہی کمرے میں رکھا گیا جہاں میری حالت خراب ہونے لگی۔ دانوں کی شدت سے مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، البتہ تصور میں مجھے موت اپنے سامنے رقص کرتی نظر آنے لگی۔ مجھے خواہش ہوئی کہ کاش میری موت میرے اپنوں کے درمیان ہوتی۔ بیماری پھیلنے کی وجہ سے ہسپتال مریضوں سے بھرا رہتا اور صبح شام کمروں سے لاشیں مردہ خانے منتقل ہو رہی تھیں۔ ایک شام کو ڈاکٹر نے اعلان کر دیا کہ پلیٹ کی یعنی

میری حالت انتہائی نازک ہے۔ اگر نو گھنٹے تک مزید نہ بگڑی تو بچنے کی امید ہو سکتی ہے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میری حالت سنبھلنے لگی اور پندرہ دن ہسپتال میں گزارنے کے بعد میں اور ہیری اپنے چہروں پر چیچک کے مستقل داغ لئے غلاموں کے باڑے میں واپس آ گئے۔ دوسرے دن ایلیزا اور ایمی بھی وہاں لائے گئے اور ہمیں ایک بار پھر گاہکوں کے سامنے خریداری کے لئے پیش کر دیا گیا۔

اگلے دن ایک میانہ قد شخص جو صورت شکل اور مزاج کے لحاظ سے بھلا آدمی نظر آتا تھا ہماری طرف متوجہ ہوا۔ پہلے وہ کئی سوالات ہماری صلاحیتوں کے بارے میں کرتا رہا پھر اس نے میری قیمت ایک ہزار ڈالر ہیری کی نو سو اور ایلیزا کی سات سو ڈالر لگائی۔ بیماری کے سبب معمولی بحث کے بعد تھیوفلس نے سودا منظور کر لیا۔

جونہی ایلیزا کو سودے کی خبر ہوئی وہ ایک بار پھر بیقرار ہو گئی۔ بیماری اور بیٹے کی جُدائی کے غم میں نہ صرف اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی بلکہ وہ ادھ موئی نظر آتی تھی میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعے اُس منظر اور اُس صورتِ حال کو بیان کروں جس میں ایلیزا کو اس کی بچی سے جُدا کیا گیا۔ اس خبر کو سنتے ہی وہ عورتوں کی قطار سے نکل کر روتی چلاتی ایمی کی طرف بڑھی اور اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ یہ دیکھ کر تھیوفلس نے ایلیزا کو رک جانے اور خاموش ہو جانے کا حکم دیا پھر ایلیزا کو بازوؤں سے پکڑ کر بچی سے جُدا کرنے لگا، لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح چمٹے ہوئے تھے کہ جُدا نہ ہوتے تھے۔ تھیوفلس نے غصے میں گالیاں دیتے ہوئے ایلیزا کو اتنا زوردار دھکا دیا کہ وہ روتی

ہوئی بچی سے الگ جا پڑی ایک بار پھر وہ فریاد کرنے لگی کہ مالک تم نے رینڈل کو تو مجھ سے جُدا کر لیا لیکن ایمی کے بغیر تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ یہ المناک منظر خریدار سے بھی دیکھا نہ گیا اور وہ ایمی کو بھی خریدنے اور دونوں کو اکٹھا رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن تھیوفلس کی شقاوت اور ہوس میں کمی کے بجائے اضافہ ہو چکا تھا اور وہ کہنے لگا ''میں اس خوبصورت بچی کو ابھی نہیں بیچوں گا۔ چند سال بعد اس کو اسی شہر کے صاحبانِ ثروت پانچ ہزار ڈالر میں ہاتھ جوڑ کر خرید لیں گے۔'' یہ سن کر ایلیزا پر ایک جنون طاری ہو گیا وہ چیخنے لگی ''میں اس کے بغیر نہیں جاؤں گی'' اُس کی پُر درد چیخوں کے درمیان تھیوفلس بلند اور غضبناک آواز میں اُس کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا ساتھ ہی ننھی ایمی کی ڈری اور سہمی ہوئی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ''ماں ! مجھے ساتھ لے چلو۔ ماں ! مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔'' یہ ایک انتہائی دردناک منظر تھا کہ ایک چاہنے والی ماں سے اس کی نہایت پیاری بچی بھی چھین کر جُدا کی جا رہی تھی۔ دیکھنے والوں کے بھی آنسو آ گئے۔ خریدار بھی افسوس کے عالم میں تھا لیکن بالآخر ایلیزا کو گھسیٹ کر جُدا کر دیا گیا اور فضا میں دیر تک اس کی بلند چیخیں اور ایمی کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔

اُس دن کے بعد ایلیزا زندگی بھر اپنے دونوں بچوں کو نہ دیکھ سکی۔ اُس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ اس نے جوانی میں جتنی مسرتیں اور آزادیاں دیکھیں تھیں اس غلامی کے ہاتھوں وہ خواب و خیال اور وہم و گمان میں بدل گئیں۔ غلامی کا یہ انداز اور جبر و تشدد کی یہ صورتِ حال دنیا کے ترقی یافتہ معاشرے کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے۔

۷

غلاموں کے باڑے سے باہر نکل کر ہیری، ایلیزا اور مجھے اپنے نئے آقا کے پیچھے پیچھے نیو آرلینز کی گلیوں سے گزرتے ہوئے دریا کے کنارے کھڑے اسٹیمر کی طرف لے جایا گیا۔ جو نصف گھنٹہ کے بعد منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس چھوٹے جہاز پر ہمارے علاوہ چند اور غلام تھے جنہیں نیو آرلینز سے خریدا گیا تھا۔ ہمارے آقا کا نام ولیم فورڈ تھا جو دریائے سرخ کے دائیں کنارے پر ریاست لوزیانہ کے مرکز میں ریپڈ نامی قصبے کا باسی تھا۔ اپنے علاقے میں اُس کو لوگ دینی مبلغ کی حیثیت سے جانتے تھے بہر حال برچ اور تھیوفلس جیسے ظالم آقاؤں کے مقابلے میں، میں نے اسے ایک شریف اور نیک دل انسان پایا۔ بلاشبہ وہ ایک مثالی آقا تھا اور اس کا غلام حسنِ سلوک کے لحاظ سے خود کو خوش قسمت کہہ سکتا تھا۔ ہم لوگوں نے دو دن اور تین راتیں اسٹیمر پر گزاریں۔ اب میرا مستقل نام پلیٹ تھا اور ایلیزا کو ڈریڈی

کے نام سے بیچا اور خریدا گیا تھا۔ فورڈ کی نیکی اور شرافت کو دیکھتے ہوئے کئی بار مجھے خیال ہوا کہ میں اُسے اپنی حقیقت اور گزشتہ مصائب سے آگاہ کروں لیکن اس کے مالی نقصان کے بارے میں سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیتا۔ بہر حال ہم ایلگزینڈریہ کے مقام پر اسٹیمر سے اُترے جو دریائے سرخ کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اور وہاں صرف ایک رات قیام کے بعد ریل گاڑی کے ذریعے وہاں سے اٹھارہ میل دور نسبتاً ایک چھوٹے سے قصبے لیموری پہنچا دیئے گئے۔ یہاں سے سات میل کے فاصلے پر فورڈ کے فارمز واقع تھے جہاں تک ہمیں پیدل جانا تھا، وہ ایک گرم دن تھا اور ابھی تک ہم تینوں چیچک کے حملے کے بعد پوری طرح صحتمند نہ ہو سکے تھے۔ تاہم فورڈ دورانِ سفر آرام کر لینے اور آہستہ آہستہ چلنے کی آزادی دیتا رہا۔ یہ پورا علاقہ نشیبی اور دلدلی تھا جہاں پر صنوبر اور شاہ بلوط کے بلند و بالا درخت تھے۔ دوپہر کے وقت ہم تین چار ایکڑ پر مشتمل صاف ستھرے میدان میں پہنچ گئے۔ جہاں ایک چھوٹا سا گھر اور اناج کی کوٹھری نظر آ رہی تھی۔ یہ مسٹر مارٹن کا گرمائی مکان تھا، عموماً بڑے زمیندار اِن جنگلوں میں گرمیاں گزارتے ہیں۔ ہم لوگوں کو باورچی خانہ میں پہنچا دیا گیا جہاں ہمیں کھانے کو آلو، مکی کی روٹی اور سور کا خشک گوشت کھانے کو ملا۔ فورڈ صاحب نے مارٹن کے ساتھ گھر کے اندر لنچ تناول کیا۔ کھانے کے بعد مارٹن نے ہم سب کا انٹرویو کیا اور ہماری قیمتیں وغیرہ معلوم کیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم پھر ٹکساس روڈ پر اگلے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔ پانچ میل مسلسل گھنے درختوں کے درمیان گزر کر غروبِ آفتاب کے قریب ہم تقریباً پندرہ ایکڑ کے وسیع میدانی علاقے میں پہنچ گئے جہاں ایک وسیع مکان کے ساتھ مرغی خانہ، غلہ کا گودام، غلاموں کے کئی کیبن اور ایک پھلدار درختوں کا باغ تھا اور باقی زمین سرسبز گھاس اور

خوبصورت پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ ماسٹر فورڈ کی رہائش گاہ پائن وڈ تھی۔ مسز فورڈ نے نئے غلاموں کو دیکھ کر ماسٹر فورڈ سے بہت خوشی کا اظہار کیا پھر ہمیں ایک سیاہ فام کنیز، سیلی کے ہمراہ غلام خانہ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ہم لوگ پیدل چلتے چلتے اتنا تھک چکے تھے کہ اندھیرا ہوتے ہی کمبل لے کر لیٹے اور فوراً گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

علی الصباح ہماری آنکھ ماسٹر فورڈ کی پکار سے کھل گئی جو اپنی گھریلو خادمہ روز کو بلا رہے تھے تاکہ وہ بچوں کے لباس وغیرہ تبدیل کرائے۔ سیلی گایوں کا دودھ دوہنا شروع کر چکی تھی اور ایک سولہ سترہ برس کا کوئلے سے زیادہ سیاہ رنگت والا لڑکا باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے میں مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ ناشتے کے بعد ایک زنگی جوان تین بیلوں والی گاڑی کے ساتھ احاطہ میں داخل ہوا جو لکڑی کے تختے اور شہتیروں سے بھری ہوئی تھی۔ فورڈ کے اس غلام کا نام والٹن تھا جو گھریلو خادمہ روز کا شوہر تھا۔ فورڈ نے مجھے اور ہیری کو والٹن کے ساتھ کام پر جانے کا حکم دیا، جانے سے پہلے مسز فورڈ نے اسٹور روم میں بلا کر ہم دونوں کو پینے کے لئے گنے کے رس کا ایک ایک بڑا ڈبہ دیا۔ فورڈ اُن دنوں ایک دولتمند آدمی تھا۔ قریبی واقع صنوبر کے جنگلات میں حصہ دار ہونے کے علاوہ اس کی بیوی کی ملکیت میں وسیع کھیت اور متعدد غلام تھے لیکن دونوں میاں بیوی مذہب اور انسانیت کی قدروں سے یکسر بیگانہ نہ تھے چنانچہ ایلیزا کو جو ابھی تک اپنے بچوں کی جدائی سے نڈھال تھی دونوں میاں بیوی تسلیاں دیتے، اس سے کوئی کام نہ لیا جاتا اور وہ بیشتر وقت میڈم فورڈ کے ساتھ رہتی اور گھریلو امور میں اس کی معاونت کرتی۔

کھاڑی پر واقع مل تک پہنچتے پہنچتے ہم دونوں والٹن سے خوب گھل مل

گئے ۔ وہ فورڈ کا بچپن کا خدمتگار تھا اس لئے فورڈ ہمیشہ اس سے مہربانی اور شفقت سے پیش آتا اور والٹن بھی مالک کے علاوہ اُسے باپ کا احترام دیتا تھا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ میں واشنگٹن سے آیا ہوں، جہاں سے اس کی بیوی روز کا بھی تعلق تھا تو اس نے وہاں کے بارے میں بہت سے اُلٹے سیدھے سوالات کرنے شروع کئے جن میں بیشتر احمقانہ تھے ۔ مِل پہنچنے پر ہماری ملاقات فورڈ کے دو غلاموں سیم اور انٹونی سے ہوئی۔ سیم کا تعلق بھی واشنگٹن سے تھا وہ بھی برچ کا شکار رہ چکا تھا اور اس کے مظالم اور بدمعاشیوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد فورڈ بھی مِل پر پہنچ گیا۔ اس نے ہم سب کو لکڑی کے لٹھوں کو شہتیر اور تختوں میں تبدیل کرنے پر متعین کر دیا۔ اس کام پر ہم لوگ موسمِ گرما کے اختتام تک مصروف رہے ۔ اتوار کے دن صبح فورڈ صاحب اپنی تمام کنیزوں اور غلاموں کو گھر پر بلاتے اور ان کے سامنے بائبل کی آیات کی تلاوت اور تفسیر بیان کرتے ، اُن کو خدا پر بھروسہ کرنے اور ایک دوسرے سے ہمدردی کرنے کی تلقین کرتے ، تاکہ ان کی دنیا و آخرت بخیر گزرے ۔ اِس تبلیغ کے نتیجے میں سیم مذہب کی طرف پوری طرح راغب ہو گیا۔ مالکن نے اسے ایک بائبل عطا کر دی اور وہ فرصت کے اوقات اس پر صرف کرتا اور جہاں کوئی دشواری پیش آتی میں اُس کی مدد کرتا جس کے لئے وہ بہت شکر گزار ہوتا۔ اس تمام صورتِ حال کو جب دوسرے گورے لوگ دیکھتے تو انہیں اچھا نہ لگتا، وہ ماسٹر فورڈ سے کہتے کہ غلاموں کے لئے یہ سب مناسب نہیں ہے۔ لیکن میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ اس سلوک سے ہم لوگ سپروائزر کے تازیانوں کے بغیر دوسرے ملوں کے غلاموں سے زیادہ کام کرتے۔

اسی جذبے کے تحت میں نے فورڈ کو ایک زیادہ منافع بخش تجویز پیش

کی۔لکڑی کے تختوں اور شہتیروں کو لاموری تک پہنچانے کی ذمہ داری فورڈ کی تھی اور سڑک کے ذریعے ترسیل پر کافی خرچ آتا تھا۔انڈین کھاڑی جس پر مل واقع تھی گہری تو کافی تھی لیکن چوڑائی بہت کم تھی بعض مقامات پر تو بارہ فٹ سے زیادہ نہ تھی اور راستے میں بڑے بڑے درختوں کے تنوں نے بہت رکاوٹیں پیدا کردی تھیں۔یہ کھاڑی ایک جھیل میں گرتی تھی جو لاموری سے ہوکر گزرتی تھی،میری تجویز یہ تھی کہ اگر اس آبی راستے کی رکاوٹیں دور کر کے تختوں اور لٹھوں کو بیڑوں کی صورت میں بہانے کے قابل بنا دیا جائے تو بار برداری کا پورا خرچ بچایا جا سکتا ہے۔مل کے فورمین آرم ٹیڈن نے اس تجویز کو یکسر ٹھکرا دیا لیکن فورڈ نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے اس پر تجربہ کرنے کی اجازت دے دی۔رکاوٹیں دور کرنے کے بعد میں نے لٹھوں کے ایسے بیڑے بنائے جو زیادہ چوڑے نہ تھے اس کام میں میرا پچھلا تجربہ کام آیا اور میں نے جان لڑا کر اس تجویز کو روبہ عمل کر دکھایا اور جلد ہی وہ دن آ گیا جب لٹھوں کی پہلی کھیپ انتہائی کم خرچ پر کم وقت میں اپنی منزلِ مقصود لاموری پہنچ گئی۔اب تو فورڈ نے میرے لئے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور ہر شخص نے میری مہارت اور محنت کو تسلیم کر لیا۔مجھے خاص طور پر فورمین آرم ٹیڈن پر اپنی برتری ثابت کر کے بہت مسرت حاصل ہوئی۔اُس دن سے لٹھوں کی لاموری تک منتقلی کا کام پوری طرح میرے کنٹرول میں دے دیا گیا،جسے میں نے موسمِ خزاں کے آغاز تک انتہائی خوش اسلوبی سے مکمل کیا،اس کام کے اختتام پر جب مل بند ہوئی تو مجھے ڈیرے پر واپس بلا لیا گیا۔ایک دن مسز فورڈ نے فورڈ سے ایک کھڈی فراہم کرنے کی فرمائش کی تاکہ سیلی اُس پر غلاموں کے لئے آنے والی سردیوں کا کپڑا بن کر تیار کرے۔فورڈ کے لئے کھڈی کا حصول مشکل معلوم ہونے لگا تو میں نے مشورہ دیا

کہ کھڈی خود بنالی جائے اور خود کو ہر فن مولا ثابت کرنے کے لئے اپنی خدمت پیش کردی۔ اجازت ملنے پر میں نے پڑوسی زمیندار کے ڈیرے پر جا کر کھڈی کی بناوٹ دیکھی اور واپس آکر دو دن کے اندر کھڈی تیار کرلی جس پر سیلی نے بہت اطمینان سے کام شروع کردیا۔ پھر تو مجھے قرب و جوار کے لئے کئی کھڈیاں بنانی پڑیں۔

اسی دوران مرمت کے چند کاموں کے لئے فورڈ نے جان ٹائی بڈ نامی ایک سفید فام ترکھان کو بلایا اور مجھے کھڈیاں بنانے کے کام سے ہٹا کر اس کی ماتحتی میں دیدیا گیا۔ دو ہفتے تک میں اس کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اصل کام عبادت گاہ کی چھت پر تختے نصب کرنا تھا، میں نے جان ٹائی بڈ کو ہر لحاظ سے فورڈ سے مختلف پایا۔ وہ چھوٹے قد کا چڑچڑا، بدمزاج اور کینہ پرور انسان تھا۔ اُس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا بلکہ جہاں ملازمت ملتی وہیں پڑا رہتا یا ایک زمیندار کے ڈیرے سے دوسرے کے ڈیرے پر منتقل ہوتا رہتا۔ اُس کی نہ تو گوروں میں کوئی وقعت تھی نہ غلاموں میں کوئی عزت۔ اُس نے جلد ہی فورڈ کا ڈیرہ چھوڑ دیا۔

ماسٹر فورڈ کے ڈیرے پر قیام کے دوران مجھے غلامی کے صرف روشن پہلو سے سابقہ پڑا۔ اس نے کبھی ہم پر جبر و تشدد روا نہ رکھا۔ وہ ہم غلاموں سے مخاطب ہوتے وقت ہمیشہ اس بات کو مدِ نظر رکھتا کہ اُسے بھی سب انسانوں کی طرح ایک دن خالقِ کائنات کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میرے بیوی بچے میرے پاس ہوتے تو میں ماسٹر فورڈ کی خدمت کرنے اور اس کی شفقتوں سے بہرہ مند ہونے میں پوری زندگی گزار دیتا لیکن میری جانب تو ظلم و جور کے مہیب بادل بڑھ رہے تھے اور میری تقدیر میں وہ تمام تشدد اور سختیاں لکھی جا چکی تھیں جن کا سابقہ صرف غلاموں کے مظلوم ترین طبقوں کو ہوتا ہے۔

۸

میری بدقسمتی کا بدترین دور اس وقت شروع ہوا جب اچانک ولیم فورڈ شدید مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ کچھ عرصے پہلے اس نے اپنے بھائی فرینکلن کے کاروباری قرضوں اور اجرتوں کی ادائیگی کی ضمانت دی تھی۔ ہوا یوں بدقسمتی سے کاروبار میں شدید نقصان کے نتیجے میں فرینکلن دیوالیہ قرار پایا اور ایک عدالتی فیصلے کے مطابق اس کے ضامن کی حیثیت سے ماسٹر فورڈ کو اُس کی ادائیگیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ماسٹر فورڈ پر جان ٹائی بڈ کو واجب الادا ایک بڑی رقم کا بوجھ بھی تھا جو اس نے ملوں، چکیوں اور کھڈی گھر وغیرہ پر کام کرنے کی اجرت کے طور پر بنائی تھی اور اب وہ بھی فوری ادائیگی کے لئے دباؤ ڈال رہا تھا صورتِ حال اتنی خراب ہوئی کہ ان ادائیگیوں کے لئے فورڈ کو اپنے اٹھارہ غلام قرض خواہوں اور جان ٹائی بڈ کے حوالے کرنے پڑے۔ ان اٹھارہ غلاموں میں سترہ تو علاقے کے

ایک متمول زمیندار نے خرید لئے اور میری بدبختی کہ جان ٹائی بڈ نے اپنی اجرتوں کے عوض میرا سودا کرلیا کیونکہ وہ میری محنت اور میرا کام دیکھ چکا تھا۔ میرا سودا چار سو ڈالر کے عوض گروی کے طور پر ہوا جو کہ ٹائی بڈ کی واجب الادا رقم سے کچھ زیادہ تھی۔ یہ بات ۱۸۴۲ء کے موسمِ سرما کی ہے جب میں ماسٹر فورڈ اور اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو کر نئے مالک کے ساتھ خلیج بوف سے متصل اس مقام پر پہنچا جہاں ماسٹر فورڈ کے ٹھیکے کا بقیہ کام جاری تھا۔ یہاں کام کرنے کا ماحول فورڈ کے ڈیرے سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے منہ اندھیرے سے لے کر رات دیر تک کام کرنا پڑتا تھا اور اُس کے دوران ایک لمحہ بھی فارغ بیٹھنے کی اجازت نہ تھی اس کے باوجود ٹائی بڈ کبھی مطمئن نہ ہوتا تھا بلکہ وہ مستقل ڈانٹ پھٹکار اور لعنت ملامت کرتا اور کبھی تعریف یا ہمدردی کا ایک بول بھی ادا نہ کرتا۔ دن بھر میں ایک وفادار غلام کی حیثیت سے ایمانداری کے ساتھ اُس کی آمدنی میں بھاری اضافے کے لئے کام کرتا اور رات گئے اس کی گالیوں اور گندے القابات کے ساتھ اپنے کیبن کی طرف واپس آتا۔

تھوڑے ہی عرصے میں ہم نے آٹے کی چکی اور باورچی خانہ پر کام مکمل کرلیا۔ اس کے بعد کھڈی گھر پر کام شروع ہوا۔ فورڈ کی طرف سے کام کی نگرانی پر چیپن نامی سپر وائزر مقرر تھا جس کی رہائش کھڈی کے کارخانے سے چند سو گز کے فاصلے پر تھی۔ اسی دوران مجھ سے ایک ایسا جرم سرزد ہو گیا جس کی سزا ریاستی قانون کے تحت موت تھی۔ یہ میری اور ٹائی بڈ کی پہلی زبردست لڑائی تھی۔ ہوا یوں کہ ایک رات کافی دیر تک کام کرنے کے بعد کیبن کی طرف جاتے ہوئے ٹائی بڈ نے مجھے حکم دیا کہ اگلے دن اندھیرے منہ اُٹھ کر چیپن سے کیلوں کا

صندوق لے کر آؤں اور پھر فوراً کام پر آ کر تختوں کی جڑائی شروع کر دوں۔ دن بھر کی سخت مشقت کے بعد کیبن پہنچ کر مجھے کھانے کے لئے مکی کی روٹی اور سوکھے گوشت کا سالن تیار کرنا پڑا۔ اس کے بعد اُسی کیبن میں موجود دوسرے غلاموں کی باتوں کی وجہ سے سونے میں مزید دیر ہوئی تاہم صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے ہی میں سپروائزر کے گھر پر آ کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ اس کو نیند سے بیدار کرنا بھی ایک غلام کے لئے کسی طرح مناسب نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ باہر آیا تو میں نے اپنے آقا کا پیغام دیا۔ اس نے کیلوں کا ایک بڑا صندوق دے کر کہا کہ ٹائی بڈ کو کیلوں کا مختلف سائز درکار ہو تو بتائے، لیکن ساتھ ہی اس نے مجھے کام فوراً شروع کر دینے کی تاکید کی اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر کھیتوں کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس نے غلاموں کو پہلے ہی بھیج دیا تھا ۔ میں اس بھاری صندوق کو کندھے پر رکھ کر کارخانے پہنچا اور فوراً کام میں جُٹ گیا۔ دن چڑھے ٹائی بڈ کارخانے میں گھستے ہی میرے قریب آیا۔ آج اس کا موڈ معمول سے زیادہ خراب معلوم ہو رہا تھا۔ وہ میرا مالک اور آقا تھا اور میرے خون اور گوشت پر پورا حق رکھتے ہوئے اسے مجھ پر ظلم روا رکھنے کا اختیار تھا اور کوئی قانون مجھے اُس کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہونے سے بچا نہ سکتا تھا۔ جونہی میں صندوق میں سے مزید کیلیں لینے کے لئے باہر آیا اس نے حقارت اور طنز کے ساتھ مجھ سے کہا ”شاید میں نے تجھے آج صبح تختے لگانے کا کام شروع کرنے کا حکم دیا تھا؟“ میں نے کہا ”جی ہاں میں دوسری طرف اسی کام پر لگا ہوا ہوں“ دوسری طرف جا کر اس نے ناپسندیدہ نظروں سے کام دیکھتے ہوئے کہا ”اور میں نے تجھے اوورسیر کے پاس جا کر کیلوں کا صندوق لانے کو کہا تھا؟“ میں نے

جواب دیا ”جناب میں لے آیا ہوں اور اوور سیر نے کہا ہے کہ اگر سائز کا فرق ہو تو کھیتوں سے واپسی پر بدل لینا“ ٹائی بڈ نے کیلوں پر ایک نظر ڈالی اور غصہ کے ساتھ صندوق کو ٹھوکر مارتے ہوئے بولا ”میرا خیال تھا کہ تم کچھ کام جانتے ہو“ میں جواباً بتانے لگا کہ ”میں نے آپ کے حکم کے مطابق عمل کیا اور اوور سیر نے جو کہا.........“ لیکن ٹائی بڈ نے سخت غضبناک ہو کر میری بات کاٹتے ہوئے مجھ پر گالیوں کی بوچھار کر دی اور برآمدے سے اوور سیر کا کوڑا اُٹھا لایا۔ یہ دیکھ کر میرے تو ہوش اُڑنے لگے۔ اُس وقت وہاں سوائے باورچی اور اوور سیر کی بیوی کے کوئی نہ تھا باقی سب ہی لوگ کھیتوں پر جا چکے تھے اور وہ دونوں بھی سامنے دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کوڑے مارنے پر آمادہ ہے۔ برج کی قید کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مجھ پر یہ ناحق تشدد ہونے والا تھا جبکہ میرا کوئی قصور بھی نہ تھا بلکہ میں تو اپنی فرمانبرداری اور محنت پر تعریف کا مستحق تھا۔ یہ سوچ کر میرا خوف غصے میں بدلنے لگا اور اس کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے طے کر لیا کہ آج میں کوڑے نہیں کھاؤں گا خواہ نتیجے کے طور پر مجھے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ کوڑا لہراتے ہوئے ٹائی بڈ نے مجھے پیٹھ ننگی کرنے کا حکم دیا تو میں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی میں نے اپنی بے گناہی پر بولنے والا تھا کہ اس نے سخت غضبناک ہو کر ایک ہاتھ سے میرا گلا پکڑا اور دوسرا ہاتھ کوڑا مارنے کے لئے اُٹھایا۔ لیکن ہاتھ نیچے آنے سے پہلے ہی میں نے کوٹ کے کالر سے پکڑ کر اُس کو اپنی طرف کھینچا اور پھر زور سے دھکا دیا تو وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر میں نے جھپٹ کر اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اوپر اُٹھا دیں تا کہ وہ سر اور کاندھا زمین سے نہ اُٹھا

سکے۔ ساتھ ہی میں نے اپنا ایک پیر اُس کی گردن پر رکھ دیا۔ اب وہ پوری طرح میرے قابو میں تھا اس وقت میری رگیں غیض و غضب میں تن گئی تھیں۔ ایک اضطراب کے عالم میں، میں نے اس کے ہاتھ سے کوڑا چھین لیا۔ وہ اپنا پورا زور لگاتے ہوئے قسم کھا کر کہنے لگا کہ وہ مجھے کل سے پہلے ختم کر دے گا لیکن اس وقت تو وہ پوری طرح بے بس تھا اور میں بتا نہیں سکتا کہ غصہ کے عالم میں، میں نے اس کو کتنی ٹھوکریں اور ٹکریں لگائیں یہاں تک کہ اس کی چیخیں نکلنے لگیں اور خدا کا واسطہ دے کر رحم کی بھیک مانگنے لگا لیکن چونکہ وہ خود رحم کے جذبے سے خالی تھا اس لئے اس پر بھی رحم نہ کیا گیا۔ اور میں نے اُس کی اتنی دُھنائی کی کہ میرے ہاتھ دکھنے لگے۔

میں اس دوران گردو پیش سے بے خبر ہو چکا تھا کہ اچانک میری نظر مسز چیپن اور پھر باورچی پر پڑی جو باورچی خانے کے در سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دراصل ٹائی بڈ کی مہیب چیخیں کھیتوں تک پہنچ رہی تھیں جنہیں سن کر اوورسیر گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچ گیا۔ لیکن اسی دوران میں نے دو چار زوردار مکے لگا کر ٹائی بڈ کو جو دھکا دیا اور ٹھوکر ماری تو وہ زمین پر کچھ دور تک لڑھکتا چلا گیا، پھر اُٹھ کر کپڑے اور بال جھاڑنے لگا۔ ہم دونوں غصہ سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے کہ اوورسیر نے چلا کر پوچھا ''کیا معاملہ ہے'' میں نے بتایا کہ ٹائی بڈ مجھے کوڑے مارنا چاہتا ہے کیونکہ میں تمہاری دی ہوئیں کیلیں استعمال کر رہا تھا۔ اوورسیر نے ٹائی بڈ سے مخاطب ہو کر صورت حال جاننا چاہی تو اس نے کہا کہ وہ کیلیں بہت بڑی ہیں۔ اوورسیر سمجھ دار انسان تھا وہ ٹائی بڈ اور میرے مزاج سے واقف تھا۔ اس نے کہا میں یہاں اوورسیر ہوں اور میں نے پلیٹ کو انہی کیلوں سے کام شروع کرنے کا

حکم دیا تھا۔ اس کی کوئی غلطی نہیں۔ اس دوران ٹائی بڈ مسلسل دانت پیستا رہا پھر
اوورسیر کو لے کر اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ دونوں کچھ باتیں کرتے رہے اور میں
سوچتا رہا کہ آیا مجھے فرار ہو جانا چاہیئے یا نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ جب
وہ دونوں اندر سے نکلے تو ٹائی بڈ اپنی واحد ملکیت یعنی گھوڑے پر بیٹھ کر چینی وِل
جانے والی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ اوورسیر چیپن میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ نہ
تو مجھے گھبرانے کی ضرورت ہے نہ کہیں فرار کی۔ پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ
تمہارا مالک بڑا بدمعاش ہے اور بہت بگڑ کر گیا ہے۔ ممکن ہے رات ہوتے ہوتے
وہ کوئی مسئلہ پیدا کرے مگر تم حوصلہ رکھو اور بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُس
وقت انتہائی پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں تھا کیونکہ مجھے اُس شدید سزا کا
اندازہ تھا جو میرے اس ردِ عمل کے نتیجے میں مجھے بھگتنی پڑے گی۔ ایک بے یار
ومددگار غلام سے اپنے سفید فام آقا کے خلاف ایک ایسا جرم سرزد ہو چکا تھا کہ
جس کا کوئی جواز پیش نہ ہو سکتا تھا۔ سزا سے بچنے کے لئے میں نے دعا کے لئے
ہاتھ بلند کر دیئے۔ اپنی بیگناہی اور بیچارگی پر میرے آنسو رواں ہو گئے اور اس
کیفیت میں تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا پھر جب میں نے سر اُٹھایا تو سامنے ماسٹر ٹائی
بڈ کو کھڑا پایا اس کے پیچھے دو گھوڑے سوار اور بھی آ رہے تھے جنہوں نے اپنے
ہاتھوں میں بڑے بڑے تازیانے اُٹھا رکھے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس
ایک موٹا سا رسہ بھی تھا۔ انتہائی غضبناک آواز کے ساتھ ٹائی بڈ نے مجھے اپنے
ہاتھ اوپر اُٹھانے کا حکم دیا میں نے نرمی سے جواب دیا کہ مجھے باندھنے کی
ضرورت نہیں کیونکہ جہاں آپ حکم دیں میں چلنے کے لئے تیار ہوں لیکن اس کے
ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر کہا کہ جو حکم دیا گیا ہے اس پر فوراً عمل کرو ورنہ ابھی

تمہارا سر پھاڑ دیا جائے گا اور جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔ اب میرے لئے کوئی راستہ نہیں تھا میں نے ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے ٹائی بڈ نے پہلے میری کلائیاں باندھیں پھر میرے دونوں بازو پیٹھ کے ساتھ کس کر باندھے۔ اس کے ساتھی نے دونوں پیر رانوں سے لے کر ٹخنوں تک اتنا جکڑ کر باندھے کہ میرے لئے ہاتھ پیر ہلانا ناممکن ہو گیا۔ رسے کے باقی حصے کے ساتھ ٹائی بڈ نے میری گردن میں پھندا ڈال دیا۔ اس کے ایک ساتھی نے ٹائی بڈ سے پوچھا کہ اب اس کو پھانسی دینے کے لئے کہاں لٹکایا جائے۔ پھر انہوں نے قریبی درخت کا انتخاب کیا۔ اس پورے عرصے میں خاموش رہا جبکہ اوور سیر چیپن تھوڑے فاصلے پر ٹہل ٹہل کر اس منظر کو دیکھتا رہا۔ ریچل اور مسز چیپن کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آچکا ہے۔ میرا دم سینے میں گھٹنے لگا مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اب اگلی صبح نہ دیکھ سکوں گا اور نہ کبھی اپنے بچوں کے چہرے دیکھوں گا، مجھ پر تو کوئی دو آنسو بہانے والا بھی نہ ہو گا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد میری لاش کے ٹکڑے قریبی نالے میں پھینک دیئے جائیں گے۔ ٹھیک اسی لمحے جب وہ تینوں مجھے کھینچتے ہوئے درخت کی طرف بڑھ رہے تھے میں نے دیکھا کہ چیپن گھر کے اندر چلا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے دونوں ہاتھوں میں پستول پکڑے ہوئے ہماری طرف بڑھنے لگا پھر ساتھ ہی اس نے بلند آواز میں کہا۔

''میری بات سنو! اب اگر تم سے کسی نے اس غلام کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو وہ زندہ نہ رہے گا کیونکہ وہ ہرگز پھانسی کی سزا کا حقدار نہیں ہے۔ اس کو قتل کرنے کا تمہارا ارادہ بہت شرمناک ہے میں نے آج تک اس سے زیادہ وفادار غلام نہیں دیکھا۔ ٹائی بڈ! اس معاملے میں تم خود غلطی پر ہو۔ تم پکے بدمعاش

ہو اس لئے تم خود کوڑوں سے پٹنے کے مستحق ہو۔ میں اس جگہ پچھلے سات سال سے اوورسیری کر رہا ہوں اور ماسٹر فورڈ کی غیر حاضری میں تمام کام سنبھالتا رہا ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں اُس کے مفادات کی حفاظت کروں اور میں یہ فرض ضرور ادا کروں گا۔ ماسٹر فورڈ نے چار سو ڈالر کے عوض اس غلام کو تمہارے پاس گروی رکھا ہے اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ تم اس غلام کی زندگی کے مالک ہو تم اسے ہر گز پھانسی نہیں دے سکتے اور اگر ایسا کیا تو تم کو قاتل قرار دیا جائے گا'' پھر باقی دونوں سے مخاطب ہو کر کہا ''اگر تم دونوں کو اپنی زندگی عزیز ہے تو فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

دراصل یہ دونوں آدمی پڑوسی زمیندار کے اوورسیر تھے۔ جن کو ٹائی بڈ اپنی مدد کے لئے بلا کر لایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے چیپن کی للکار پر فوراً راہِ فرار اختیار کی۔ ٹائی بڈ نے ایک لمحہ رک کر چیپن کی طرف دیکھا اور پھر اس کے بُشرے کی سنجیدگی دیکھ کر بزدل کی طرح سر جھکائے اپنے گھوڑے کی طرف مریل قدموں کے ساتھ بڑھنے لگا، اگلے ہی لمحے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے ساتھیوں سے جاملا۔

میں اسی حالت میں رسن بستہ کھڑا تھا، کیونکہ اپنی جگہ سے حرکت ہی نہ کر سکتا تھا۔ اُن لوگوں کے جانے کے بعد چیپن نے ریچل کو حکم دیا کہ وہ فوراً کھیتوں پر جا کر لاسن سے کہے کہ وہ بغیر کوئی وقت ضائع کئے بھورے گھوڑے کو لے کر آجائے۔ یہ بھورا گھوڑا اپنی تیز رفتاری کے لئے مشہور تھا۔ لاسن حاضر ہوا تو چیپن نے کہا ''لاسن تم اسی لمحے ماسٹر فورڈ کے پاس چلے جاؤ اور اس سے فوراً یہاں آنے کی درخواست کرو۔ اس کو بتا دینا کہ ٹائی بڈ اور اس کے ساتھی پلیٹ کو قتل کرنے

کے درپے ہیں۔ تمہیں ہر صورت میں دوپہر تک پائن وڈ (ولیم فورڈ کا مکان) پہنچ جانا چاہیئے۔'' پھر اس نے لاسن کو روانگی کا پاس دیا جسے پاتے ہی لاسن نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

۹

اس روز دو گھڑی دن چڑھے ہی گرمی بڑھنے لگی اور سورج کی تیز شعاعوں نے زمین کو تپا دیا۔ میں ننگے سر اور ننگے پاؤں تھا اور تھوڑی ہی دیر میں پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ اگر وہ لوگ مجھے درختوں تک لے جا چکے ہوتے تو کچھ سایہ مل جاتا لیکن رسّوں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے چند قدم چلنا تو درکنار میں گردن تک نہ ہلا سکتا تھا اور اسی حالت میں کھڑا تھا جس میں وہ تینوں مجھے چھوڑ گئے تھے۔ شدید تھکن کے عالم میں، میں نے سوچا کہ گر کر زمین پر لیٹ جاؤں لیکن یہ سمجھ کر کہ رسّوں کی جکڑ کی وجہ سے میں دوبارہ اُٹھ نہ سکوں گا اور زمین کی تپش مجھے جلا کر رکھ دے گی میں ضبط کے ساتھ کھڑا رہا۔ رسّوں کی سختی سے میرے بازو، کلائیاں اور ٹانگوں میں سوجن ہونے لگی۔

اس تمام عرصے میں چیپن میرے قریب تک نہ آیا، نہ ہی وہ اپنے معمول کے مطابق کھیتوں پر گیا، بلکہ سارا وقت مکان کے برآمدے میں ایک اضطراب

کے عالم میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتا رہا۔ کبھی اس کی نظریں مجھ پر پڑتیں اور کبھی سڑک پر، ایسا معلوم ہوتا تھا اسے بھی خطرہ ہے کہ کہیں ٹائی بڈ ایک بار پھر اور زیادہ آدمیوں اور اسلحے کے ساتھ حملہ آور نہ ہو جائے۔ اُس کے بشرے سے ظاہر تھا کہ وہ میری زندگی بچانے کے لئے بے چین ہے۔

ایک بار مجھے گمان گزرا کہ اگر اُسے مجھ سے ہمدردی ہے تو وہ مجھے رسّوں سے رہائی کیوں نہیں دلاتا اور سائے میں کیوں نہیں پہنچاتا، لیکن پھر میں خیال نے کیا کہ شاید وہ چاہتا ہے کہ فورڈ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ ٹائی بڈ اور اس کے ساتھیوں نے کس بے دردی اور ظلم کے ساتھ مجھے پھانسی دینے کے لئے تیار کیا تھا۔ یہ بات بھی میرے لئے تعجب خیز تھی کہ ٹائی بڈ دوپہر کو دوبارہ حملہ آور کیوں نہ ہوا۔ لیکن جب واپس آ کر لاسن نے بتایا کہ پائن وڈ جاتے ہوئے اس کو ٹائی بڈ نے دیکھ لیا تھا اور یہ سمجھ کر ڈر گیا ہو گا کہ اب یہ آس پڑوس کے تمام زمینداروں کو مدد کے لئے بلانے جا رہا ہے، لہٰذا موقع واردات سے دور رہنا بہتر ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا رہا میری حالت بگڑتی گئی۔ درد اور گرمی سے میرے ہوش اُڑنے لگے۔ صبح سے ایک نوالہ بھی میرے منہ میں نہ گیا تھا۔ بھوک، پیاس اور درد کی شدت سے میں بے ہوشی کے قریب پہنچنے لگا۔ اس وقت ریچل نے ڈرتے ڈرتے پانی کا ایک گلاس میرے ہونٹوں سے لگایا اور سرگوشی میں بولی ''ہائے پلیٹ! میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتی ہوں'' یہ کہتے ہوئے وہ فوراً باورچی خانے کی طرف بھاگی تا کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ میں نے کبھی سورج کو اتنی سست رفتاری سے حرکت کرتے اور اتنی آتشیں شعاعیں برساتے نہیں محسوس کیا۔

ٹھیک غروبِ آفتاب کے وقت ماسٹر فورڈ گھوڑے پر سوار نمودار ہوا تو میرا دل امید وبیم کے عالم میں دھڑ کنے لگا۔ دروازے ہی پر چیپن نے کچھ مختصر بات کی اور پھر فورڈ سیدھا میری طرف بڑھا اور کہنے لگا ''پلیٹ! تمہاری تو بہت بُری حالت ہے۔'' میں نے کہا ''شکر ہے کہ آپ آ گئے'' پھر اس نے جیب سے چاقو نکال کر میری رسیاں کاٹ دیں۔ اور گردن سے پھانسی کا پھندا اُتارا۔ میں نے چلنے کی کوشش کی لیکن ایک شرابی کی طرح لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا۔ فورڈ گھر کے اندر چلا گیا' اور اسی دوران ٹائی بڈ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار یارڈ میں داخل ہوا۔ پھر دونوں پارٹیوں کے درمیان دیر تک گفتگو جاری رہی۔ مجھے صرف ماسٹر فورڈ کا دھیما لہجہ اور ٹائی بڈ کی کرخت آوازیں سنائی دیتی رہیں لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ آخر کار وہ تینوں بظاہر ناخوش انداز میں واپس ہو گئے۔

میں نے قریب پڑا ہوا ہتھوڑا اُٹھایا تا کہ ماسٹر فورڈ پر یہ ظاہر کر سکوں کہ میں اب بھی اپنے کام کے لئے مستعد ہوں لیکن ہتھوڑا میرے ہاتھ میں سنبھل نہ سکا۔ اس وقت معمولی سی حرکت سے درد کی شدید ٹیسیں اُٹھ رہیں تھیں غرض میں بہ مشکل رینگتا ہوا اپنے کیبن تک پہنچ کر بے دم حالت میں لیٹ گیا۔ ہیری اور ایلیزا نے گوشت کا ایک ٹکڑا گرم کر کے مجھے کھانے کو دیا مگر درد اور تکلیف سے میری بھوک اُڑ چکی تھی اس لئے مجھ سے کچھ کھایا نہ گیا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے میرے لئے دلیہ اور کافی تیار کی جو میں نے پی لی۔ اس دوران تمام غلام مرد اور عورتیں کیبن میں میرے گرد جمع ہو گئے تو ریچل نے سب کے سامنے دن بھر کی روداد پوری تفصیل سے بیان کی۔ جب اس نے میری اُن ٹھوکروں کا ذکر کیا جسے کھا کر ٹائی بڈ زمین پر دور تک لڑھکتا چلا گیا تھا تو سب نے زوردار قہقہہ لگایا، مجھے

تعریفی نظروں سے دیکھا اور پھر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔
رات گہری ہونے پر اچانک چیپن کیبن کے دروازے پر آیا اور مجھ سے کہا۔ "پلیٹ! آج رات تم کو اپنے کیبن کے بجائے گھر کے اندر ہم لوگوں کے پاس سونا ہوگا۔ تم اپنا کمبل لے کر آجاؤ" میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور اس کے ساتھ چلا گیا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ یہ احتیاط اس لئے ضروری ہے کہ ٹائی بڈ رات کو مجھے قتل کرنے کی ایک بار پھر کوشش کر سکتا ہے اور کیبن میں قتل کر کے گواہ کی عدم موجودگی میں وہ سزا سے بھی بچ سکتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اگر وہ سو غلاموں کے سامنے بھی قتل کرے تو ریاست لوزیانہ کے کالے قانون کے مطابق ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ اُس رات، اپنی غلامی کے بارہ برسوں کے دوران پہلی اور آخری مرتبہ میں اتنی آرام دہ جگہ پر سویا، آدھی رات کے قریب کتے نے زور زور سے بھونکنا شروع کیا۔ چیپن نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا لیکن کچھ پتہ نہ چلا یہاں تک کہ کتا خاموش ہو گیا۔ چیپن نے کہا کہ "پلیٹ مجھے یقین ہے کہ ٹائی بڈ کہیں چھپ کر تم کو تلاش کر رہا ہے بہرحال اب اگر میں سو جاؤں اور کتا دوبارہ بھونکے تو تم مجھے جگا دینا۔" ایک گھنٹے کے بعد کتا پھر زور زور سے بھونکنے اور بیرونی پھاٹک تک دوڑ بھاگ کرنے لگا۔ چیپن نے باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا اور پھر کتا بھی اپنے "ڈاگ ہاؤس" میں واپس چلا گیا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ رات کی پریشانی اور کم خوابی کی وجہ سے میری تھکن اور بدن کی سوجن میں تو کمی نہ آئی تاہم اپنے کیبن میں آ کر میں ہیری اور ایلیزا کے تیار کردہ ناشتے میں شریک ہوا اور اپنے کام پر پہنچ گیا۔ دوسرے سپر وائزروں کی طرح چیپن کا معمول تھا کہ وہ صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے گھوڑے پر

بیٹھ کر کھیتوں کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ لیکن اس روز خلافِ معمول وہ پہلے کھڈی گھر میں آیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے ٹائی بڈ کے بارے میں کوئی دید یا شنید تو نہیں ملی۔ نفی میں جواب ملنے پر اس نے مجھے پوری طرح خبردار رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ ٹائی بڈ انتہائی منتقم مزاج اور بدطینت شخص ہے اور کسی وقت اچانک حملہ آور ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ یہ بات کر ہی رہا تھا کہ ٹائی بڈ نمودار ہوا، اس وقت تو چیپن اور فورڈ کی موجودگی کی وجہ سے میں بالکل نہیں ڈرا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت میرے پاس نہیں رہ سکتے تھے۔ اس طرح میں ایک مستقل عذاب اور خوف میں مبتلا رہنے لگا۔ بہرنوع ٹائی بڈ آدھے گھنٹے تک کھڈی گھر میں ٹھہرا اور بیشتر وقت مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر تیسرے پہر وہ باہر برآمدے میں فورڈ کے پاس بیٹھا باتیں کرتا اور کبھی اخبار پڑھتا رہا۔ جب فورڈ لنچ کے وقت اپنی رہائش گاہ ''پائن وڈ'' کے لئے روانہ ہوا تو کچھ دیر بعد ٹائی بڈ پھر میرے پاس آیا کچھ احکامات دئے اور واپس چلا گیا۔

اگلے ہفتے کھڈی گھر کا کام مکمل ہو گیا۔ اس دوران میں نے ٹائی بڈ کو بدسلوکی کا کوئی موقع نہیں دیا۔ پھر مجھے بتایا گیا کہ ٹائی بڈ نے مجھے کرائے پر عارضی طور سے پیٹر ٹینر نامی زمیندار کو دے دیا ہے اور اب مجھے اس کے لئے ایک بڑھئی مائر کے زیرِ نگرانی کام کرنا ہوگا۔ پیٹر ٹینر مسز فورڈ کا برادرِ نسبتی تھا اور اس علاقے کا بڑا زمیندار اور بہت سے غلاموں کا مالک تھا۔ شاید یہ انتظام ماسٹر فورڈ کے مشورہ پر کیا گیا تھا۔ بہرحال میں اس فیصلے پر بہت خوش اور مطمئن تھا۔ پیٹر بھی مجھ پر روا رکھے گئے ظلم و تشدد اور میری جوابی کاروائی سے آگاہ تھا۔ کیونکہ اس واقعہ کی شہرت دور و نزدیک علاقوں میں پھیل چکی تھی۔ پیٹر ٹینر نے

اپنی گفتگو سے مجھ پر اپنے سخت گیر ہونے کا تاثر تو دیا لیکن میں نے اسے ایک بذلہ
مذاق اور خوش گفتار انسان پایا۔ جب میں اس کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے کہا
''اچھا تو تم وہ غلام ہو جس نے اپنے مالک پر کوڑے برسائے اور لاتوں اور مکوں
سے خوب دُھنائی کی۔ گویا تم غلاموں میں اپنا جداانداز رکھتے ہو لیکن یاد رکھو میں
تمہاری تمام اکڑ اور طنطنہ نکال دوں گا۔ یہاں تمہاری کوئی بدمعاشی نہیں چلے گی۔
اب جاؤ اور شرافت سے اپنا کام سنبھالو۔''

اس تقریر یا ڈانٹ پھٹکار کے بعد مائر مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور کام پر
لگا دیا۔ اِس طرح میں اُس کی زیر نگرانی اُس کے معیار اور تسلی کے مطابق تقریباً
ایک ماہ تک کام کرتا رہا۔

اپنے بہنوئی ولیم فورڈ کی طرح ٹینر بھی ہر اتوار کو اپنے غلاموں کو بائبل کا
درس دیتا تھا لیکن اس کے انداز اور مقاصد مختلف تھے۔ وہ عہد نامۂ جدید کا اچھا
مُفسّر تھا۔ اس کی جاگیر میں آنے کے بعد پہلے اتوار کو جب میں درس میں شریک
ہوا تو اس نے لوقا کے بارہویں باب کی تلاوت شروع کی اور جب سینتالیسویں
آیت پر پہنچا تو ایک بار اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور یوں بیان کیا۔

''اور وہ غلام جس نے اپنے آقا کی مرضی سمجھتے ہوئے (اس نے یہاں
رُک کر ایک بار پھر سب غلاموں کو غور سے دیکھا) اس کے مطابق تیاری نہ کی تو وہ
کوڑوں کی مار کھائے گا۔'' کیا تم سب نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہے پھر اس
نے اپنا چشمہ اُتار کر مزید وضاحت کی ''وہ غلام جو اپنے آقا کی فرمانبرداری نہیں
کرتا اسے بہت سے کوڑوں کی سزا ملے گی اور سمجھ لو کہ بہت سے کوڑوں کا مطلب
چالیس، سو یا ڈیڑھ سو تک ہو سکتے ہیں۔ یہ ہے انجیل مقدس کا فرمان'' اس طرح

ٹینز اپنے بے زبان سامعین کو دیر تک اس آیت کا مفہوم سمجھاتا رہا۔ نشست کے آخر میں اس نے اپنے تین غلاموں وارنر، ول اور میجر کو بلایا اور مجھے بلند آواز سے متوجہ کر کے بولا "پلیٹ! تم نے ٹائی بڈ کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا تھا میں تو تب جانوں کہ تم ان تینوں کو بھی اسی طرح گھسیٹو، میں اس دوران ایک میٹنگ سے ہو کر آتا ہوں۔ پھر اس نے لکڑی کا شکنجہ لانے کا حکم دیا۔ یہ شکنجہ لکڑی کے دو تختوں سے بنایا گیا تھا دونوں میں ایک ایک اتنا بڑا سوراخ تھا کہ سزا کے مستحق غلام کی پنڈلی اس میں پھنس سکے پھر دونوں تختوں کو ملا کر تالہ لگا دیا جاتا تاکہ وہ زمین سے نہ اُٹھ سکے، اور اس حالت میں اس پر کوڑے برسانا آسان ہو۔

دراصل ٹینز کے بقول یہ تینوں غلام کھیتوں سے پھل چوری کر کے کھا جانے کے مجرم تھے اس لئے بائبل کے احکام کے مطابق ان کو شکنجے میں کس کر کوڑے لگانا مذہبی فریضہ بھی تھا۔ تینوں غلاموں کو شکنجے میں کس کر پیٹر نے چابی مجھے دی اور بیوی بچوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چینی وِل کے گرجا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹینز فیملی کے چلے جانے کے بعد تینوں غلاموں نے مجھ سے مہربانی کی درخواست کرتے ہوئے شکنجے سے رہائی چاہی۔ تپتی ہوئی زمین پر انہیں پڑا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا رحم آیا اور اپنی مصیبت اور تکلیف یاد آ گئی۔ میں نے اس وعدے پر شکنجہ کھول دیا کہ ٹینز کی آہٹ پر وہ دوبارہ اس میں آ جائیں گے۔ شکر گزاری کے طور پر وہ مجھے کسی وقت اپنے ساتھ پھلوں کی کیاریوں پر لے جانے کو آمادہ ہو گئے۔ پیٹر کے آتے آتے وہ دوبارہ شکنجوں میں چلے گئے۔ اس نے آتے ہی تینوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "تو گویا آج تم لوگ زیادہ چہل قدمی نہیں کر سکے۔ دراصل میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ آقا کی نافرمانی اور چوری کی

سزا مذہب کے مطابق کیا ہے۔"

پیٹر کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ وہ خود مذہبی ہے اور اپنے غلاموں پر بھی تہہ دل سے اس کا نفاذ کرتا ہے۔

بہر حال اب میں ان ہلکے پھلکے واقعات سے قطع نظر کرتے ہوئے ٹائی بڈ سے اپنی دوسری انتہائی مہیب اور جان لیوا لڑائی کی داستان بیان کرتا ہوں، جس کے دوران مجھے ایک خطرناک دلدل عبور کرنا پڑی۔ ایسی دلدل، جس پر پیدل چل کر کسی جاندار کے لئے زندہ بچ جانا معجزے سے کم نہیں۔

۱۰

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ماسٹر فورڈ کی مداخلت اور ثالثی کے نتیجے میں محدود مدت کے لئے معاوضے پر میرے مالک ٹائی بڈ نے مجھے ٹینز کے حوالے کیا تھا۔ چنانچہ ایک مہینہ گزرنے کے بعد جب ٹینز کو میری ضرورت نہ رہی تو مجھے اپنے آقا کے پاس واپس بھیج دیا گیا۔ وہ ان دنوں روئی کی گانٹھیں بنانے کی مشین تیار کر رہا تھا۔ یہ جگہ فورڈ کے کھڈی گھر سے کچھ فاصلے پر نسبتاً ویران مقام پر تھی۔ یہاں پہنچ کر میں ٹائی بڈ کے ساتھ کام پر لگ گیا۔ اس دوران وہاں اکثر و بیشتر ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہ ہوتا تھا۔ مجھے چیپن کی نصیحت یاد تھی کہ ٹائی بڈ کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہئے مبادا وہ کسی وقت حملہ آور ہو کر مجھے زخمی کر دے۔ خوف اور خطرے کے اس عالم میں میرا وقت اس طرح گزرتا کہ میری ایک آنکھ کام پر اور دوسری ٹائی بڈ پر ہوتی۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جانفشانی اور مہارت

سے اپنا کام کروں گا تا کہ اسے کسی قسم کی زیادتی کرنے کا موقع نہ ملے اور رفتہ رفتہ میری طرف سے اس کا بغض وعناد ختم ہو جائے۔

میری واپسی کے تیسرے دن چیپن کسی کام کے سلسلے میں رات تک کے لئے چینی وِل چلا گیا۔ اس روز صبح ہی سے ٹائی بڈ ایک بنچ پر بسولے میں ہینڈل فٹ کر رہا تھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا ''تو نیچے کے رُخ پر صحیح رندہ نہیں چلا رہا'' میں نے کہا ''یہ لائن کے مطابق تو بالکل درست ہے'' وہ چیخ پڑا ''جھوٹے بکواسی!'' میں نے انتہائی نرم لہجے کہا ''اچھا جناب! اگر آپ کہتے ہیں تو میں نیچے کے رُخ پر مزید رندہ پھیرتا ہوں'' اور اس کی خواہش کے مطابق ابھی ایک ہی چھیلن اُتاری تھی کہ وہ پھر چلانے لگا ''اب تو نے بہت زیادہ چھیل کر لکڑی بیکار کر دی ہے۔'' ساتھ ہی گالیوں کی بوچھار کرنے لگا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق کام کرنے کی کوشش کی تھی تاہم اس خوف کے عالم میں ہاتھ میں رندہ لئے خاموش کھڑا ہو گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کام کو کیسے آگے بڑھاؤں اور ساتھ ہی بیکار رہنے کی جرأت بھی نہ تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے ٹائی بڈ کے غیض وغضب کی کوئی حد نہ رہی۔ ایک گندی گالی دیتے ہوئے اس نے بنچ پر سے کلھاڑی اُٹھائی اور میری طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا کہ آج میں تیرا سر پھاڑ دوں گا۔ اُس وقت میرے سامنے موت اور زندگی کا سوال تھا۔ کلھاڑی کا تیز پھل دھوپ میں چمک رہا تھا اور اگلے لمحے میرے بھیجے میں داخل ہونے والا تھا۔ میرا دماغ تیزی سے گھوما۔ میں نے سوچا کہ اگر میں کھڑا رہا تو وار سے بچنا محال ہے اور اگر میں بھاگوں تو بھی میری پیٹھ پر اس کا وار کاری پڑے گا۔ اب بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا میں نے پوری قوت سے اچھل کر ایک ہاتھ سے اس کا کلھاڑی والا

ہاتھ قابو میں کیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ٹیٹوا اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُس پر خون سوار ہو چکا تھا جو اس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے ایک سانپ کو سر سے پکڑ کر قابو میں کر لیا ہے اور معمولی سی بھی سستی میرے لئے مہلک ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ میں زور زور سے چلا کر کسی کو مدد کے لئے بلاؤں لیکن چیپن تو غیر حاضر تھا اور باقی لوگ دور کھیتوں میں تھے۔ آخر کار زندہ بچنے کی آخری تدبیر کے طور پر میں نے پوری قوت سے اُس کو ایک ایسی زور دار کک لگائی کہ وہ ایک چیخ کے ساتھ گھٹنوں کے بل زمین پر آ رہا۔ پھر میں نے تیزی سے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کلھاڑی چھین کر دور پھینک دی۔ سخت غصے اور دیوانگی کے عالم میں قریب پڑی شاہ بلوط کی پانچ فٹ لمبی لکڑی اُٹھا کر وہ میری طرف دوڑا لیکن میں نے ایک بار پھر اس کی کمر پر ایسی زوردار لات ٹکائی کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔ میں نے فوراً ڈنڈا اُٹھا کر اس کی پہنچ سے دور پھینکا۔ اسی دوران وہ بنچ پر پڑے ہوئے بسولے کی طرف لپکا۔ خوش قسمتی سے بسولے کے پھل کے اوپر بھاری تختہ پڑا تھا اور جتنی دیر میں وہ اسے کھینچ کر نکالتا میں اچھل کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اُس وقت میرا دماغ اور جسم دونوں تیزی سے کام کر رہے تھے۔ اس پر قابو پاتے ہوئے ایک بار پھر میں نے اس کا گلا اپنی گرفت میں لے لیا معمولی دباؤ پڑتے ہی اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ گوری رنگت دم گھٹنے سے سرخ اور پھر سیاہ ہونے لگی۔ آنکھیں دیدوں سے باہر آنے لگیں ایک لمحے کے لئے تو میرے جی میں آئی کہ اس شیطان کا خاتمہ ہی کر دوں لیکن دماغ نے سمجھایا کہ اس کے قتل کے جرم میں مجھے بھی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اب میرے سامنے صرف فرار کا راستہ تھا جس پر چل کر اگرچہ ساری زندگی گمنامی اور

خانہ بدوشی میں بسر ہوگی لیکن موجودہ صورتِ حال تو اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ٹائی بڈ کو بنچ سے زمین پر پٹخا قریبی جنگلے کو کود کر پار کیا اور کپاس کے اُن کھیتوں سے دور رہتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا جہاں غلام اپنے کام میں مصروف تھے۔ تقریباً نصف میل دوڑنے کے بعد میں نے ایک اونچی سی منڈیر پر چڑھ کر پیچھے نظر دوڑائی جہاں سے سارا منظر دور تک نگاہوں کے سامنے تھا۔ میں نے دیکھا کہ ٹائی بڈ مکان کے اندر گیا گھوڑے کی زین لے کر باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں امید و بیم کے تصورات میں گھرا ہوا تھا۔ کبھی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتا اور کبھی متوقع حالات کا تصور کر کے پریشان اور دل شکستہ ہو جاتا کہ اب میرا کیا بنے گا۔ کون میرا ساتھ دے گا۔ میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔ کبھی دعا کے لئے ہاتھ بلند کرتا کہ "خدایا! تو نے ہی مجھے نئی زندگی بخشی ہے اور میرے دل میں زندگی سے محبت کا جذبہ اُبھارا ہے اب مجھے بے سہارا نہ چھوڑنا۔ خدایا! اپنے مجبور اور بے کس غلام پر رحم فرما اور اسے مکمل بربادی سے بچا لے اگر تو نے میری مدد نہ کی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا" لیکن میں نے محسوس کیا کہ خدا نے بھی انسانوں کے ٹھکرائے ہوئے اپنے حقیر بندے کی طرف سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔

تقریباً پندرہ منٹ اسی عالم میں گزرے تھے کہ بہت سے غلاموں کے شور کی آوازیں بلند ہونے لگیں جس میں میرے فرار کا غلغلہ نمایاں تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ٹائی بڈ اور اس کے دو گھڑ سوار ساتھی آٹھ دس کتوں کے غول کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اُس کے دونوں ساتھیوں کا تعلق قریبی دیہات سے تھا اور کتے کھوجی اور خونخوار ترین نسل کے تھے۔ اس زمانے میں غلاموں کے مالک

ایسے کتے ضرور رکھتے تھے تا کہ ضرورت پڑنے پر وہ مفرور حبشی غلاموں کا کھوج نکالیں۔ اس سے پہلے اس علاقے میں کسی غلام کے بارے میں دریا پار کر کے فرار ہونے کا واقعہ نہیں سنا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو تیرنا بالکل نہ سکھایا جاتا تھا اور فرار ہونے والا یا تو دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو جاتا یا کتے اس کو پوری طرح قابو میں کر لیتے لیکن خوش قسمتی سے میں نے نوجوانی ہی میں اپنے شہر میں تیرنے میں پوری مہارت حاصل کر لی تھی۔ میں ابھی باڑ ہی پر تھا کہ کتے کپاس کے گودام تک پہنچ گئے۔ اگلے ہی لمحے ان کی مخصوص بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں جو اس بات کا اعلان تھا کہ وہ میری تلاش کی مہم کے لئے آمادہ و تیار ہیں۔ اب یہاں کھڑا رہنا میرے لئے سخت خطرناک تھا۔ میں نے ندی کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ یہاں زمین انتہائی دلدلی تھی۔ اگرچہ جان کے خطرے اور خوف کے اضطراب نے میری قوت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا، لیکن دلدلی زمین کی وجہ سے میری رفتار خاصی سست تھی اب مجھے کتوں کی مہیب آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں گویا، وہ مجھ سے قریب تر تھے اور کسی لمحے اچھل کر میری پیٹھ پر اپنے لمبے لمبے دانت گاڑ سکتے تھے اور مجھے چیر پھاڑ کر رکھ سکتے تھے۔ اس تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور سانس اُکھڑنے لگی۔ ایک بار پھر میرے دل سے دعا نکلی "خدایا مجھے کسی طرح اس دلدل سے نکال کر گہرے پانی تک پہنچا دے تا کہ میں خونخوار کتوں سے تو بچ جاؤں خواہ دریا میں غرقاب ہو جاؤں۔" بھاگتے بھاگتے میں نے محسوس کیا کہ میں پنڈلیوں تک پانی میں آ چکا ہوں ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوا کہ کتے مجھ سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر ہیں اس وقت پورا دلدلی علاقہ ان کی بھیانک اور خوفناک چیخوں سے لرز رہا تھا لیکن میرے پانی میں داخل ہو جانے کی

وجہ سے غالباً وہ گڑ بڑا گئے تھے اور صحیح رُخ کا تعین نہیں کر پا رہے تھے۔ میں جوں جوں گہرے پانی کی طرف بڑھ رہا تھا میری آس بھی بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ پانی میری کمر اور پھر سینے سے اوپر تک آ گیا اور اب یقیناً کتوں کو میرا کھوج نکالنے میں ناکامی ہو رہی تھی کیونکہ پانی کی دیوار کی وجہ سے میری بو باس ان کی ناکوں تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے بھونکنے کی وحشیانہ آوازیں اب مدھم پڑتی جا رہی ہیں، آخر کار میں دریا کے بڑے دھارے میں داخل ہو گیا یہاں سے پانی کا تیز دھارا نیچے کی طرف بہہ رہا تھا اس طرح اب کتوں تک ٹائی بڈ کے مفرور غلام کی مہک پہنچنے کا سوال ہی نہ تھا۔

اس دھارے سے گزرنے کے بعد پانی اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ اس میں دوڑنا ممکن نہ رہا۔ اس سے آگے جس بڑے دلدلی علاقے سے گزرنا پڑا (بعد میں لوگوں سے معلوم ہوا کہ) اسے مگرمچھوں کی دلدل کہا جاتا ہے۔ تیس چالیس میل کا یہ دلدلی علاقہ گھنے کانٹے دار درختوں سے پُر تھا جہاں دور دور تک کوئی انسانی آبادی نہ تھی البتہ جنگلی جانور مثلاً ریچھ، چیتے، اور حشرات الارض یعنی سانپ، بچھو اور مگرمچھ بھرے پڑے تھے۔ تیزی میں بار بار میرا ہاتھ یا پیر اُن زہریلے سانپوں سے مَس ہو جاتا تھا لیکن معجزانہ طور پر میں ان کے ڈنکوں سے محفوظ رہا۔ اسی تگ و دو میں میرے ایک جوتے کا پورا تلا نکل کر غائب ہو گیا اور اب بار بار کانٹے چبھنے کی وجہ سے میری رفتار خاصی کم ہو گئی۔ آگے بڑھنے پر مجھے کئی چھوٹے بڑے مگرمچھ بھی دکھائی دیئے، کچھ پانی میں اور کچھ ٹوٹے درختوں کے تنوں پر پڑے تھے۔ دو ایک بار تو تیزی میں میرا پیر ان پر جا پڑا۔ اس صورت میں جونہی انہوں نے حملہ کے لئے گردن اُٹھائی میں فوراً پلٹ پڑا اور تیز رفتاری سے مڑ گیا۔ چونکہ

مگرمچھوں کو مڑنے میں دیر لگتی ہے لہٰذا مجھے ان سے بچ نکلنے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ تقریباً دو بجے دن کو میں نے آخری بار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں، غالباً انہوں نے ندی عبور نہیں کی۔ میرے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے ۔کئی گھنٹوں کی مسلسل بھاگ دوڑ اور خوف سے میرے اعصاب شل ہو رہے تھے لیکن پکڑے جانے کے فوری خطرے سے نکلنے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور میں نے اپنا سفر جاری رکھا اور اب میری پوری توجہ درندوں اور حشرات الارض سے خود کو محفوظ رکھنے پر تھی۔ ایک بڑی لکڑی کی مدد سے زمین ٹٹول کر میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا رہا۔ آخر کار سورج غروب ہو گیا اور رات نے اپنی سیاہ چادر سے پورے علاقے کو ڈھانپ لیا۔ تاہم میں گرتا پڑتا اس خوف کے باوجود آگے بڑھتا رہا کہ اگلے قدم کے ساتھ ہی کوئی زہریلا سانپ ڈنک مار دے یا کوئی بپھرا ہوا مگرمچھ اپنے جبڑوں سے میرا بھیجا چبا ڈالے۔ یہ خوف کتوں کے پیچھے لگنے سے کہیں زیادہ دل کو تہہ و بالا کئے دیتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد چاند کی مدھم کرنیں کہیں کہیں درختوں کی شاخوں سے چھن کر بہت ہی ہلکی سی روشنی دکھانے لگیں۔ آدھی رات تک میں اس امید پر بدقت تمام چلتا رہا کہ جلد ہی نسبتاً کم خطرناک اور انسانی آبادی والے علاقہ تک پہنچ جاؤں گا لیکن اس کے بعد ایک بار پھر پانی گہرا ہونے لگا اور راستہ چلنا مزید دشوار ہو گیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ اب میرا آگے بڑھنا ممکن نہ رہے گا ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اگر میں کسی آبادی میں پہنچ بھی گیا تو غلاموں کے لئے مروجہ ریاستی قانون کے مطابق میرے پاس راہداری نہ ہونے کی وجہ سے کوئی سفید چمڑی والا مجھے گرفتار کر کے اس وقت تک کے لئے جیل میں ڈلوا سکتا ہے جب تک میرا آقا مجھے اپنی ملکیت ثابت کر کے اپنے ساتھ

نہ لے جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت مجھے سب سے زیادہ خطرہ کس سے تھا۔ کتوں سے، مگر مچھوں سے یا انسانوں سے۔

بہرحال آدھی رات کے بعد میں ایک جگہ رُک گیا۔ اُس وقت کی خوفناک کیفیت کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھ سے پہلے کسی انسان کے قدم اس زمین پر نہ پڑے تھے۔ آدھی رات کے وقت میرے پیروں کی آہٹ نے تمام پرندوں اور حشرات الارض کو بیدار کر دیا تھا اپنے آرام میں خلل محسوس کر کے ان سب نے بیک وقت صدائے احتجاج بلند کر رکھی تھی جس کی وجہ سے منظر میں ایک عجیب دہشت پیدا ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں چاند ایک بار پھر درختوں کے اوپر سے جھانکنے لگا تب میں نے سوچا کہ چلتے رہنے ہی میں میری عافیت ہے۔ تھوڑی سی روشنی میں میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی جو جھاڑیوں اور کانٹوں سے الجھ الجھ کر جا بجا پھٹ چکے تھے۔ جسم اور چہرہ خراشوں اور کیچڑ کی چھینٹوں سے پُر تھا۔ کھڑے پانی میں موجود کائی نے میری شکل کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا کہ شاید میرا پہچانا جانا مشکل تھا۔ ایک پیر جس میں جوتا نہ تھا کانٹوں سے اس بُری طرح زخمی ہو چکا تھا کہ زمین پر رکھنا دشوار تھا پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ کچھ اور فاصلہ طے کرنے پر دلدلی زمین قدرے سخت محسوس ہونے لگی اور پانی بھی کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ میرے قدم خشک زمین کو چھونے لگے۔ صبح کا دھندلکا چھٹا تو اردگرد کے منظر سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں پائن وڈ کے علاقہ میں کسی کھیت کے قریب ہوں۔ چند قدم چل کر مجھے دو آدمی نظر آئے ان میں سے ایک غلام اور دوسرا اس کا مالک تھا۔ وہ دونوں جنگلی سوروں کا شکار کر رہے تھے۔ میں ڈرا کہ اب گورا مجھ سے پاس طلب کرے گا اور میرے انکار پر مجھے اپنے قبضے

میں لے لے گا۔ سخت تھکن کی وجہ سے میں بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ اچانک مجھے اپنی ہیئت کذائی سے فائدہ اُٹھانے کی ترکیب سوجھی۔ میں نے اپنے بگڑے چہرے کو اور بگاڑ کر تیزی سے گورے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وحشیانہ انداز میں سوال کیا ''ولیم فورڈ کا گھر کہاں ہے؟'' فوراً جواب ملا ''یہاں سے سات میل کے فاصلے پر صنوبر کے جُھنڈ سے پرے'' ٹکساس روڈ کے بائیں طرف چلو تو تم ولیم فورڈ کے مکان پر پہنچ جاؤ گے'' میں کوئی بات کئے بغیر آگے بڑھ گیا اور وہ دونوں بھی مجھ جیسے بدہیئت انسان سے جان چھڑا کر خوش نظر آرہے تھے میں بتائے ہوئے راستہ پر کچھ آگے بڑھا تو ایک بڑا سا الاؤ جلتا ہوا ملا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے پاس رُک کر میں اپنے کپڑے خشک کر لوں۔ پھر خیال آیا زیادہ دن چڑھا تو ضرور کوئی شخص مجھ سے پاس کا سوال کرے گا لہٰذا میں نے سفر جاری رکھا۔ آخر کار تقریباً آٹھ بجے دن کو میں ماسٹر فورڈ کے مکان پر پہنچ گیا۔ اُس وقت تقریباً تمام غلام اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر مسز فورڈ نمودار ہوئیں لیکن میرا حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ انہوں نے مجھے نہ پہچانا۔ ایک لمحے کے بعد فورڈ صاحب خود باہر نکل آئے۔ اب مجھے ضبط کا یارا نہ رہا اور میں نے گزشتہ دن سے لے کر اُس وقت کے حالات تفصیل سے بیان کر دیئے۔ اس فرشتہ صفت انسان نے ہمدردی اور توجہ سے میری باتیں سن کر تسلی و تشفی کے کلمات کہے مجھے اپنے ساتھ باورچی خانے لے کر آئے اور جون کو میرے لئے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا کیونکہ چوبیس گھنٹے سے میرے منہ میں ایک دانہ تک نہ گیا تھا، جون نے کھانا تیار کر کے میرے سامنے رکھا تو مسز فورڈ از راہ کرم اپنے نعمت خانے سے ایک پیالہ دودھ اور کئی قوت بخش مزیدار چیزیں لے کر آگئیں

جن کے ذائقوں سے ہم غلاموں کے کام ودہن نا آشنا تھے۔ لیکن کھانوں سے بڑھ کر مجھے اصل خوشی اُن تسلی اور ہمدردی کے کلمات سے ہوئی جو اُن دونوں میاں بیوی نے میرے لئے ادا کئے۔

کھانا ختم ہوتے ہی مجھے کیبن میں چھوڑ کر وہ لوگ چلے گئے تا کہ میں آرام کرسکوں جلد ہی میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ عالمِ خواب میں گزشتہ روز کی کٹھنائیوں سے گزرتا ہوا میں اپنے بیوی بچوں کے درمیان پہنچ گیا جن کے چہرے دیکھنے اور آوازیں سننے کے لئے میں ترس رہا تھا۔

۱۱

شام کے قریب میں گہری نیند سے بیدار ہوا تو تھکن کافی حد تک کم ہو چکی تھی لیکن پورا جسم اکڑا اور سوجا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ جونؔ نے میرے لئے شام کا کھانا تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران سیلی میرے کیبن میں آ کر تسلی و تشفی کی باتیں کرنے لگی۔ حالانکہ وہ خود ان دنوں بہت پریشان تھی۔ اُس کا ایک بچہ اتنا شدید بیمار تھا کہ اس کے بچنے کی امید نہ رہ گئی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں ٹہلتے ہوئے سیلی کے کیبن تک اس کے بچے کو دیکھنے چلا گیا۔ وہاں سے نکلا تو مسز فورڈ کے باغیچے میں چہل قدمی شروع کر دی تا کہ ہاتھ پیروں کی جکڑن کھل جائے سردیوں کے موسم کا آغاز ہو چکا تھا۔ پرندوں کی چہکار کم کم تھی اور درختوں کے ملبوس اُترتے جا رہے تھے لیکن گلاب کی بہت سی اقسام اپنے رنگ بکھیر رہی تھیں اور انگور کی بیلوں نے دور تک اپنا جال پھیلا رکھا تھا۔ پھلدار پیڑوں پر مالٹے، آڑو

اور انار پکنے کے قریب تھے۔ میں ماسٹر اور مسز فورڈ کی مہربانیوں احسان اور شکر گزاری کے جذبے سے سرشار ہو کر انگوروں کی بیلوں کی تراش خراش اور پھلدار درختوں کے قریب لگی گھاس پھوس اُکھاڑنے میں مصروف ہو گیا جو بعض جگہ بہت زیادہ اُگ آئی تھی۔ اسی اثناء میں مسز فورڈ بھی وہاں آ گئیں انہوں نے میرے جذبۂ خدمت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تمہاری حالت زیادہ محنت کرنے کے قابل نہیں ہے اور تمہیں کئی دن آرام کرنا ہو گا۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بے شک میرا جسم شدید تھکن سے اکڑا ہوا ہے اور پیر کانٹوں سے زخمی ہیں لیکن میں اپنے محسنوں کی تھوڑی بہت خدمت کر کے خوشی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ غرض اگلے تین دن میں نے خوب محنت کر کے باغ کو گھاس پھوس اور خشک شاخوں سے پاک صاف کر کے خوبصورت بنا دیا۔ چوتھے دن صبح کے وقت ماسٹر فورڈ نے مجھے اپنے ساتھ نہر پر چلنے کا حکم دیا۔ اس وقت صرف ایک گھوڑا موجود تھا باقی خچر اور گھوڑے کھیتوں پر جا چکے تھے میں نے خود پیدل چلنے پر آمادگی ظاہر کی اور سیلی اور جون کو خدا حافظ کہہ کر گھوڑے کے ساتھ دوڑنے لگا۔ ماسٹر فورڈ نے کئی بار مجھے اپنی جگہ کچھ دور گھوڑے پر بیٹھنے کی پیشکش کی لیکن میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ میں بالکل تھکا ہوا نہیں ہوں۔ بہرحال انہوں نے رفتار کم رکھی اور مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے معجزانہ طور پر بچ جانے میں تم پر خدا کا خاص کرم ثابت ہوتا ہے جیسے کہ حضرت دانیال شیروں کے غول سے اور حضرت یونس مچھلی کے پیٹ سے خدا کے فضل سے بچ کر نکل آئے تھے پھر انہوں نے نہایت ہمدردانہ انداز میں مجھ سے دریافت کیا کہ آیا مصیبت کی ان گھڑیوں میں کبھی مجھے خدا کے حضور التجائیں اور دعائیں کرنے کا

خیال آیا۔ میں نے بتایا کہ درحقیقت تو میں اس پورے عرصے سراپا دعا بنا رہا اس پر ماسٹر فورڈ نے کہا کہ ایسے حالات میں انسان کا دل فطری طور پر اپنے خالق کی طرف جھکتا ہے۔ اطمینان اور خوشحالی کے دنوں میں جب کسی خوف وخطر کا سامنا نہ ہوتو انسان خدا کی طرف سے غافل ہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس کی نافرمانی پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن مصائب اور ابتلا کے گرداب میں جب اسے کوئی حامی ومدد گار نظر نہیں آتا اُس وقت منکر وملحد انسان بھی اُسی کی مدد اور پناہ کا طلبگار ہوتا ہے۔ پورے دورانِ سفر وہ مجھ سے اسی طرح کی خدا پرستی اور خدائی جلالت و عظمت کی باتیں کرتے رہے۔

فورڈ کے فارم سے تقریباً پانچ میل پہلے ہمیں ایک گھڑسوار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ نزدیک ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ٹائی بڈ تھا۔ اس نے ایک نظر تو مجھ پر ڈالی لیکن پھر مجھے یکسر نظرانداز کرتے ہوئے ماسٹر فورڈ کے ہم رکاب چلنے لگا جبکہ میں بدستور ان کے پیچھے دوڑتا اور ان کی باتیں سنتا رہا۔ ماسٹر فورڈ نے اُسے بتایا کہ کس طرح سخت شدائد اور مشکلات سے گزر کر آج سے تین دن پہلے میں اُن کے ڈیرے پر پہنچا ہوں۔

ٹائی بڈ نے فورڈ کی موجودگی کے پیشِ نظر اپنی معمول کی گالی گلوچ والی زبان تو نہیں استعمال کی لیکن انتہائی تعجب کے ساتھ کہنے لگا "میں نے آج تک کسی کو اتنا تیز دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں ریاست لوزیانہ کے تمام غلاموں کے درمیان سو ڈالر کی شرط لگاتا ہوں اگر کوئی اِسے دوڑ میں ہرا سکے۔ حادثے کے روز میں نے جون ڈیوڈ کو پچیس ڈالر کی پیش کش کی تا کہ اسے زندہ یا مردہ پکڑ لے لیکن یہ اُس کے تربیت یافتہ کتوں سے بھی دوڑ میں بازی لے گیا۔ ٹم چینی کے

شکاری کتے اِس کے کھاڑی اور دلدل کی جھاڑیوں میں گھسنے سے پہلے اس کو پکڑنے کے قریب تھے کہ یہ تیزی سے دوڑ کر گہرے پانی میں غائب ہو گیا۔ تین فٹ کی گہرائی تک ہم گھوڑوں پر اور پیدل چلتے رہے آخر کار ہمیں اس وقت اپنی کوشش ترک کرنا پڑی جب باقی ساتھیوں نے خیال ظاہر کیا کہ یقیناً اب پلیٹ ڈوب چکا ہوگا۔ اس وقت کے بعد سے اب تک پورے علاقے میں اِس کی تلاش میں رہتا ہوں کہ شاید یہ زندہ ہو اور کہیں بھی ملے تو میں اسے گولی سے اُڑا دوں۔ لیکن اب تو مجھے اس کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ بہر حال میرے نزدیک یہ ایک چھلاوہ اور بلا ہے۔" جب وہ اپنی ناکامی کی داستان بیان کر چکا تو ماسٹر فورڈ نے کہا "یہ لڑکا تو بہت وفادار اور انتہائی محنتی ہے مجھے تو اس کو پہنچنے والی تکلیفوں اور اذیتوں کے بارے میں معلوم ہو کر سخت افسوس ہوا کہ اس کے ساتھ اتنا غیر انسانی سلوک کیا گیا۔ ٹائی بڈ! اِس تمام واقعے میں سراسر تمہاری غلطی ہے۔ غلاموں پر کلھاڑیوں اور بسولوں سے حملہ کرنا انتہائی شرمناک ہے، ایسے حربے استعمال کرنے پر تو سارے غلام راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے یا پھر کھاڑی کا دلدلی علاقہ ان کی لاشوں سے پَٹ جائے گا۔ ان کو اپنا وفادار اور تابعدار رکھنے کے لئے اسلحہ استعمال کرنے کے بجائے ان سے ہمدردی اور مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ ہم تمام زمینداروں کو ایسی حرکتوں سے دور رہنا چاہیے۔ بہر حال مسٹر ٹائی بڈ! تم نے زیادتی کی حد کر دی اور میرے خیال میں تو تم اور پلیٹ اکٹھے چل ہی نہیں سکتے۔ تمہیں اس سے خدا واسطے کا بیر ہے اور تم اسے قتل تک کرنے میں نہ ہچکچاؤ گے اور یہ اپنی جان بچانے کے خوف سے ایک بار پھر فرار ہو جانے سے دریغ نہ کرے گا۔ لٰہذا میرا مشورہ تو یہی ہے کہ یا تو تم اسے فروخت کر دو یا کم از کم

کرائے پر کسی کو دے دو اور سنو! جب تک تم اس مشورے پر عمل کرو میں اسے تمہاری ملکیت سے الگ رکھنے کا اہتمام کرتا ہوں۔"

ماسٹر فورڈ راستے بھر اسی انداز سے ٹائی بڈ کو سمجھاتے رہے تاہم میں نے اس اثناء میں اپنی زبان بالکل بند رکھی۔ فارم پر پہنچ کر وہ دونوں تو ریسٹ ہاؤس میں داخل ہو گئے اور میں نے فورڈ کے حسب الحکم ایلیزا کے کیبن کی مرمت کا کام سنبھال لیا۔ کھیت میں کام کرنے والے غلام اور مزدور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ میرے کھاڑی میں غرق ہو جانے کی افواہ عام ہو چکی تھی۔ اس رات سب میرے کیبن میں میری داستانِ غم سننے کے لئے جمع ہو گئے۔ ان کو یقین تھا کہ فرار کے جرم میں مجھے سخت سے سخت سزا کا سامنا کرنا ہوگا جو پانچ سو درّوں سے کم نہ ہوگی۔ ایلیزا بولی "بے چارہ پلیٹ! اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ یہ کھاڑی میں ڈوب کر مر جاتا کیونکہ اس کا ظالم آقا اسے قتل کرنے سے باز نہ آئے گا۔" لاسن نے اظہارِ خیال کیا "اگر اوور سیر چیپن کو سزا پر مامور کیا گیا تو وہ رحمدل انسان ہے اور یقیناً زیادہ سختی نہ کرے گا" اس پر میری، ریچل اور برسٹل نے رائے زنی کی "اگر یہ کام ماسٹر فورڈ کے سپرد کیا گیا تو شاید درّوں کی سزا ہی نہ ہو۔ غرض وہ سب اسی طرح ہمدردی کی باتیں کر کے مجھے تسلیاں دیتے رہے، سوائے کنٹکی جون کے جو غم واندوہ کی فضا میں بھی روایتی فلموں کی طرز پر مزاحیہ کردار ادا کر رہا تھا وہ ٹائی بڈ اور شکاری کتوں کی بے بسی اور کبھی میری تیز رفتاری کو مزاحیہ انداز میں اداکاری کے ساتھ بیان کر کے خود بھی قہقہے لگاتا اور حاضرین کو بھی لوٹ پوٹ کر دیتا۔

اگلے دن صبح کو ٹائی بڈ فارم سے چلا گیا۔ سہ پہر کے قریب جب میں جننگ مشین کے قریب ٹہل رہا تھا میں نے ایک خوبصورت اور خوش لباس شخص کو

دیکھا۔ میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے پوچھا ''تم ہی ٹائی بڈ کے بندے ہو؟'' میں نے تعظیماً اپنا ہیٹ اُتارتے ہوئے گردن جھکا کر اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا ''کیا تم میرے لئے کام کرنا پسند کرو گے؟'' اس سوال پر میری امید بندھی کہ اس طرح ٹائی بڈ سے میری جان چھٹ جائے گی لہٰذا میں نے فوراً جواب دیا ''بسر و چشم جناب!'' ''اور شاید تم نے پیٹر ٹینز میں مائر کے پاس بھی کام کیا تھا'' اس نے پوچھا۔ ''جی ہاں! اور ان کا حُسنِ سلوک اور مہربانیاں مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔'' میرا مودبانہ جواب سن کر اس نے بتایا ''میں نے تمہارے مالک سے تم کو اپنے کام کے لئے اجرت پر لے لیا ہے۔ تمہیں یہاں سے چالیس میل کے فاصلے پر دریائے سرخ کے آخری حصے پر واقع زرعی فارم پر کام کرنا ہو گا۔'' یہ مسٹر الڈرٹ تھے جو ماسٹر فورڈ کے فارموں سے آگے اُسی خلیج کے نچلے حصے میں رہتے تھے۔ بہرنوع اگلی صبح میں ان کے ایک غلام سام کے ساتھ چار خچروں والی گاڑی پر جو مختلف اشیاء سے لدی ہوئی تھی ان کے موضع کی طرف روانہ ہو گیا۔ مسٹر ایلڈرٹ اور مائرا اپنے اپنے گھوڑوں پر تھے۔ ان کے غلام سام نے بتایا کہ وہ چارلس ٹاؤن کا رہنے والا ہے جہاں اس کی ماں، بھائی اور بہنیں ہیں۔ اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا کہ ٹائی بڈ تو یقیناً انتہائی کمینہ خصلت انسان ہے لیکن میرا آقا جلد ہی اس سے تم کو خرید کر اپنی ملکیت میں لے لے گا۔

غروب آفتاب کے قریب ہم اپنی منزل مقصود کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ یہ راستہ محض پتلی سی پگڈنڈی تھی جس پر گاڑی بمشکل چل رہی تھی۔ پگڈنڈی کے علاوہ تمام علاقہ دلدلی تھا جہاں پر بانس اور بید کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے جن کے پار کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سام نے بتایا کہ یہاں جنگلی جانور مثلاً چیتے اور ریچھ

بکثرت پائے جاتے ہیں اور کھڑے پانیوں میں جا بجا مگر مچھ بھی موجود ہیں۔
یہاں سے نکل کر ہم ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ کہتے ہیں کہ برسوں پہلے سیٹرن نامی ایک شخص نے جیل سے فرار ہو کر اس مقام پر واقع بید کے گھنے جنگل میں پناہ لی تھی اور پھر کچھ علاقہ صاف کر کے اپنی ضرورت کے مطابق کاشتکاری شروع کر دی۔ اس طرح برسوں تنہائی کی زندگی گزارتا رہا لیکن ایک دن ریڈ انڈین کے ایک گروہ نے اس کی تنہائی میں داخل ہو کر اس کو قتل کر دیا اور زراعت پر قبضہ کر لیا۔ اس حوالے سے گرد و نواح میں عجیب و غریب داستانیں مشہور ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیدوں کے اس جنگل پر بدروحوں کا سایہ ہے اور اب بھی کبھی کبھی یہاں کی خاموشی کو توڑتی ہوئی سیٹرن کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ بہرحال اب یہ جگہ کھیت کھلیان کے بجائے جنگلی جھاڑیوں اور خاردار درختوں سے پوری طرح ڈھکی ہوئی ہے۔ یہاں سے گزر کر ہم اس مجوزہ میدانی علاقے میں پہنچ گئے جہاں ایلڈ رٹ ایک وسیع علاقے میں زرعی فارم قائم کرنا چاہتا تھا۔

اگلے دن صبح ہی سے ہم نے اپنی درانتیاں اور کلھاڑیاں سنبھالیں اور سب سے پہلے دو کیبنوں کے لائق جگہ صاف کی۔ مالکوں یعنی ایلڈ رٹ اور مائر کے لئے اور خود اپنے، سام اور اُن غلاموں کے لئے جو جلد ہی آ کر ہم میں شامل ہونے والے تھے۔ یہ مقام دریائے سرخ سے زیادہ دور نہ تھا جس کے کنارے صنوبر اور شاہ بلوط کے بلند و بالا درخت قدرتی طور پر اُگے ہوئے تھے جن کے لٹھے اور تختے بنا کر ہم نے عارضی کیبن تیار کر لئے۔ یہاں ہمارے لئے سب سے تکلیف دہ چیز خطرناک مچھر اور پسو تھے جو تمام وقت ہمارے کان ناک اور

منہ میں گھسے جاتے تھے اور جلد کی تہوں میں داخل ہو کر جسم کو متورم کر دیتے تھے۔ بہرنوع یہاں کی ویرانی اور کیڑے مکوڑوں کی یلغار کے باوجود میرے نزدیک یہ جگہ جنت سے کم نہ تھی۔ کم از کم ٹائی بڈ جیسے ظالم انسان سے جان محفوظ تھی۔ میں صبح سے شام تک خوب محنت سے اپنا کام کرتا تھا اور اکثر سخت تھکن بھی ہو جاتی تھی لیکن رات کو سکون کی نیند سوتا اور صبح کو بے خوف ہو کر کام میں لگ جاتا تھا۔

اگلے پندرہ دن کے اندر الڈرٹ کے دیگر فارموں سے چار سیاہ فام لڑکیاں آ کر ہماری شریکِ کار ہو گئیں۔ یہ چاروں محنتی اور مضبوط تن و توش کی مالک تھیں۔ ان کو کلہاڑیاں پکڑا کر میرے اور سام کے ساتھ درخت کاٹنے پر مامور کر دیا گیا۔ اپنے کام میں یہ مردوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں تھیں۔ درختوں کی کٹائی کے علاوہ زمین جوتنے سے لے کر سڑک بنانے تک سارے کام وہ بلا تکان کر سکتی تھیں۔

کام سے خوش ہو کر ایلڈرٹ نے وعدہ کیا کہ اگر میں نے اسی طرح محنت سے کام کیا تو وہ مہینے میں ایک بار تین دن کے لئے دوستوں سے ملنے ماسٹر فورڈ کے ڈیرے پر جانے کی اجازت دیا کرے گا۔ چنانچہ پانچویں ہفتے جب میں نے وعدہ یاد دلایا تو اس نے بخوشی اجازت دے دی کہ سنیچر کی رات کو جا کر منگل کی صبح تک اپنے کام پر واپس آ جاؤں۔ میری روانگی کے وقت اچانک ٹائی بڈ آ نکلا اور جب اُسے معلوم ہوا کہ مجھے فورڈ کی جاگیر پر جانے کی اجازت مل گئی ہے تو اسے یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے ایلڈرٹ سے کہا کہ غلاموں کے ساتھ اتنی نرمی بالکل مناسب نہیں لیکن ایلڈرٹ نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ میں نے وعدہ کیا ہے اور اب میں اسے مایوس نہ کروں گا اتوار کی صبح میں نے اپنا

کمبل لپیٹ کر ایک لاٹھی پر لٹکایا اور پاس ملنے کا انتظار کرنے لگا کافی انتظار کے بعد ٹائی بڈ اپنے کمرے سے نکلا اور میری طرف حقارت سے ایک کاغذ کا پُرزہ پھینکا، یہ پاس تھا جس پر لکھا تھا۔

''اس غلام (پلیٹ) کو فورڈ کی جاگیر تک جانے کی اجازت دی جاتی ہے اس شرط پر کہ منگل کی صبح تک واپس اپنے کام پر آجائے'' جان ٹائی بڈ

میرے علم میں تھا کہ اگر کوئی غلام کہیں بھی بغیر پاس کے پکڑا جائے تو کوئی بھی سفید فام اسے کوڑوں کی سزا دے کر اُس کے آقا کے پاس واپس بھیج سکتا ہے۔ چنانچہ راستے میں کئی لوگوں نے مجھ سے پاس طلب کر کے دیکھا۔ دراصل اکثر صورتوں میں کسی مفرور غلام کو پکڑنا بڑی کمائی کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ کسی وجہ سے اگر اصل آقا کا پتہ نہ چلے تو پکڑنے والا کسی کے ہاتھ فروخت کر کے مفت میں پیسے کما لیتا ہے بصورت دیگر اصل مالک تک پہنچا کر بہر حال وہ انعام کا مستحق تو ہو ہی جاتا ہے۔

فورڈ کے فارم پر پہنچتے پہنچتے مجھے شام ہوگئی۔ وہ شام میں ایلیزا کے کیبن میں اپنے دیگر ساتھیوں لاسن اور ریچل کے ساتھ گپ شپ کرتے گزاری۔ ایلیزا پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھے بڑا دھچکا سا لگا۔ جب ہم واشنگٹن سے روانگی کے وقت ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے تو وہ ایک صحت منداور گداز جسم کی خوبصورت عورت تھی اور اپنے ریشمی لباس اور زیورات میں انتہائی پُرکشش شخصیت کی مالک تھی لیکن بچوں کی جدائی اور غلامی کی سختیوں نے اب اُسے اُس ایلیزا کے ایک کمزور سے سائے میں بدل دیا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے اور تیزی طراری کا نام بھی نہ تھا۔ اتنے کم عرصے میں اس کی کمر جھک گئی تھی اور وہ ستر

سال کی کمزور سی بڑھیا معلوم ہو رہی تھی۔ غلامی کے انتہائی معمولی لباس میں وہ
کیبن کے ایک کونے میں ایک مریض کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اُس دن کے بعد
پھر میری اور اس کی ملاقات کبھی نہ ہوسکی البتہ یہ پتا چلا تھا کہ چونکہ وہ کھیتوں میں
کام کرنے کے قابل نہ رہ گئی تھی اس لئے اسے ایک معمولی رقم کے عوض پیٹر
کامٹین کے نواح میں آباد ایک شخص کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ غم واندوہ کی ماری
دل شکستہ عورت کو جس کی جسمانی طاقت جواب دے چکی تھی اس کا مالک کام نہ
کرنے پر غضبناک ہو کر کبھی کبھی اس پر بے رحمی سے کوڑے برساتا، گالیاں دیتا
لیکن ظاہر ہے اب اس میں تاب وتوانائی ختم ہو چکی تھی۔ مجھے کامپٹن کے کسی غلام
کی زبانی ایلیزا کی دردناک رحلت کا حال معلوم ہوا تھا۔ اپنی دُکھ بھری زندگی کے
آخری چند ہفتے کے دوران وہ اپنے اجاڑ اور شکستہ کیبن کے فرش پر اپنے ساتھی
غلاموں کے رحم وکرم پر پڑی رہتی کہ وہ اس کے حلق میں چند قطرے پانی ٹپکا دیں
یا چند نوالے خوراک ڈال دیں۔ اس کے آقا سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ وہ پالتو جانور
سمجھ کر ہی کبھی اس کا حال معلوم کر لیتا۔ آخر کار ایک شام جب اُس کے ساتھی
کھیتوں پر سے واپس آئے تو اُسے کیبن میں مردہ پایا۔ شاید دن کے کسی حصے میں
موت کے فرشتے کو اس کے حالِ زار پر رحم آگیا اور اس نے بدنصیب عورت
کو غلامی اور درد وغم سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔

اگلا دن ختم ہوتے ہوتے میری طبیعت اُچاٹ اور بیزار ہوگئی اور میں
ساتھیوں سے اجازت لے کر واپسی کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ صرف پانچ میل سفر
طے کرنے پر ٹائی بڈ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے جلد واپسی کی وجہ پوچھی تو میں نے
کہا میں مقررہ وقت سے پہلے پہنچنا چاہتا ہوں تا کہ دیر کی شکایت نہ ہو۔ اس نے

بتایا کہ بہرحال اب اگلے فارم سے آگے جانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس نے مجھے اسی ایڈون اِپس کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ ہم اکٹھے اگلے فارم پر پہنچے تو میری نئے مالک سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھ سے چند معمول کے سوالات کیئے اور اسی وقت کلھاڑی اور بسولا بنانے کا حکم دے کر کسی طرف نکل گیا۔

یہ جان کر کہ اب میں ٹائی بڈ کی ملکیت میں نہیں رہا مجھے ایک اطمینان و سکون حاصل ہو رہا تھا۔ اگرچہ مجھے ایڈون اِپس کی خصلتوں اور مزاج کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا لیکن اتنا تو میں سمجھتا تھا کہ ٹائی بڈ سے بدتر تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال اُس دن کے بعد میری ٹائی بڈ سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

۱۲

ایڈون اِپس جس کا اس سرگزشت کے بقیہ حصے میں بار بار ذکر آئے گا دراز قد اور مضبوط تن و توش والا انسان تھا، چہرے کی چوڑی ہڈیوں اور مڑی ہوئی ناک کے ساتھ وہ رومی نژاد معلوم ہوتا تھا۔ گوری رنگت اور نیلی آنکھوں والا ایڈون اگرچہ اپنے بشُرے سے نہایت ذہین اور تیز طرار نظر آتا تھا لیکن زبان کھولتے ہی اس کا اکھڑ پن ظاہر ہو جاتا اور پتا چل جاتا تھا کہ وہ تعلیم جیسی نعمت سے قطعی محروم ہے۔ اشتعال انگیز گفتگو میں وہ بوڑھے پیٹر ٹیز سے کہیں آگے تھا۔ شروع میں جب میں اس کی ملکیت میں آیا تو وہ شراب کا انتہائی رسیا تھا اور کبھی کبھی تو دو دو ہفتے شراب و کباب کی محفلوں میں ڈوبا رہتا۔ تاہم جس زمانے میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو اس نے کافی حد تک اپنی اصلاح کر لی تھی اور پینے پلانے میں اعتدال کی راہ پر آ گیا تھا، پہلے تو شراب نوشی اور سرمستی کے عالم

میں اس کی عجیب کیفیت ہو جاتی ۔ بے ہنگم آواز سے گانا، بیہودہ انداز میں ناچنا اور اپنے غلاموں کی پشت پر تفریحاً تازیانے برسانا، پھر اُن کی چیخوں سے لطف اندوز ہونا اس کے لئے بڑے حیات بخش اور دلچسپ مشغلے تھے لیکن ہوش وحواس کے عالم میں وہ کسی حد تک خاموش اور سنجیدہ رہتا تھا۔ البتہ کاہل اور کام چور غلاموں کی درستی کے لئے کوڑوں سے پورا کام لیتا تھا۔ نوجوانی کے دور میں وہ کوچوان اور اوورسیر کے فرائض انجام دے چکا تھا تاہم اب وہ ایک بڑے قطعہ اراضی پر قابض تھا جو دراصل اس کے چچیا سسر جوزف کی ملکیت تھی جسے انہوں نے زراعت کے لئے اپس کی تحویل میں دیا تھا اور اب وہ اس پر کپاس کی کاشت کراتا تھا۔

اس پورے علاقے میں وہ کپاس کا کامیاب ترین زمیندار مانا جاتا تھا۔ کپاس کی کاشت کا مختصر احوال اور اس کام میں کھیت غلاموں کے کردار کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کپاس کی کاشت کے ابتداء میں زمیندار دو خچروں، تین غلاموں اور ایک ہل پر مشتمل متعدد ٹیمیں بنا دیتے ہیں۔ عموماً مارچ کے مہینے میں سب سے پہلے ہل چلا کر تقریباً چھ چھ مربع فٹ کی کیاریاں اور ان کے گرد پانی کے لئے نالیاں تیار کی جاتی ہیں۔ آخری بار ہل چلاتے وقت خچر، غلام اور ہل کے پیچھے پیچھے ایک غلام لڑکی گردن میں بیج کا تھیلا لٹکائے بیج گراتے ہوئے دوڑتی رہتی ہے اور اس کے پیچھے ایک خچر ایک غلام اور ایک لکڑی کا تختہ ہوتا ہے جس کے ذریعے بیج کو چھپانے اور زمین کو برابر کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ کپاس کا پودا عموماً ایک ہفتے میں زمین سے سر نکال لیتا ہے جس کے دس دن بعد پہلی نلائی اور گوڑائی

ضروری ہے۔ ایک غلام خچر کے ذریعے پودوں کے درمیان ہل چلاتا ہے جبکہ دوسرا غلام پیچھے پیچھے اپنی کھرپی کے ذریعے جڑی بوٹی کی صفائی کرتا جاتا ہے۔ اگلے دو ہفتوں میں دوسری اور تیسری گوڑائی اور نلائی کی جاتی ہے۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں چوتھی اور آخری گوڑائی کی جاتی ہے جس کے دوران کیاریوں کے گرد پانی کی گہری نالی بھی بنائی جاتی ہے۔ ان چاروں مرحلوں کے دوران تازیانہ بردار اوورسیر گھوڑے پر سوار غلاموں کی مسلسل نگرانی کرتے ہیں۔ غلاموں کی ٹیموں کے درمیان تقریباً ایک گز کا فاصلہ ہونا چاہئے اگر غلام کی سُستی یا کسی اور وجہ سے فاصلہ بڑھنے لگے تو اوورسیر کا کوڑا غلام کی پیٹھ پر پڑنے میں دیر نہیں لگتی بلکہ میرا تو یہی مشاہدہ ہے کہ ان مراحل میں صبح سے شام تک کوڑوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ کپاس کی کاشت میں گوڑائی اور نلائی کی بہت اہمیت ہے جو اپریل سے جولائی تک جاری رہتی ہے۔ اگست کے آخری ہفتے میں کپاس کی چنائی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کام کے لئے تمام غلاموں کو ایک بورا اور ایک بڑا ٹوکرا دیا جاتا ہے جسے وہ اپنے جسم کے آگے اور پیچھے گردن سے باندھ لیتے ہیں اور کھیت سے کپاس چن چن کر اس میں جمع کرتے رہے ہیں۔ شروع کے دنوں میں چنائی کی رفتار تیز رکھنے کے لئے غلاموں پر اوورسیروں کو کوڑوں کے ساتھ متعین کیا جاتا ہے۔ رات کو کام بند ہونے پر تمام بوروں اور ٹوکروں کا وزن کیا جاتا ہے اور مقررہ وزن سے کم چنائی کرنے والے غلاموں کو مثالی سزا کے طور پر بیس کوڑے کھانے پڑتے ہیں۔ عام طور پر ایک دن میں کم از کم دو سو پونڈ کپاس کی چنائی کی مقدار ضروری سمجھی جاتی ہے حالانکہ ناتجربہ کاری، عمر کے فرق اور بعض غلاموں کی جسمانی کمزوری کی بدولت یہ ہدف ہر ایک لئے آسان نہیں ہوتا۔

اوقاتِ کار صبح کی روشنی نمودار ہونے سے لے کر رات کی تاریکی پھیلنے تک ہوتے ہیں جس کے درمیان صرف دس پندرہ منٹ کا وقفہ سرد اور خشک گوشت اور روٹی کے ٹکڑے نگلنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ چاندنی راتوں میں آدھی رات تک کام لیا جاتا ہے۔

دن بھر کی کپاس کی چنائی کا کام مکمل ہونے کے بعد اپنے کیبن میں واپس جانے سے پہلے ہر غلام کے فرائض میں اپنے خچر کو تھان پر پہنچانا اور اس کے لئے چارہ کاٹ کر ڈالنا شامل ہے۔ اس طرح رات گئے تھکے ہارے غلام کو اپنے کیبن میں پہنچ کر اپنے لئے ہاتھ کی چکی سے اناج پیسنا اور پھر اگلے دن دوپہر تک کے لئے روٹیاں تیار کرنا ہوتی ہیں۔ ہر اتوار کو تمام غلاموں کو ہفتے بھر کے لئے اناج اور چار پونڈ سوّر کی خشک گوشت کی بوٹیوں کا راشن دے دیا جاتا ہے اِس کے علاوہ کافی، چائے، شکر یا گھی وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ میں اپنا اناج ایک لکڑی کے ڈبّے میں رکھتا تھا۔ غلاموں کے کیبن میں تمام برتنوں کے طور پر صرف ناریل یا کدو کے کشکول نما تونبے مہیا کئے جاتے ہیں جن سے پانی کے گلاس، جگ، کھانے کی پلیٹ اور غرض تمام کراکری کا کام لیا جاتا ہے۔ کھانا کھاتے کھاتے ہر صورت میں آدھی رات ہو جاتی ہے اور پھر اگلی صبح وقت پر آنکھ نہ کھلنے کے خوف سے غلام عام طور پر فوراً اسی مقام پر جانوروں کے قابلِ استعمال کمبل لپیٹ کر پڑ رہتے ہیں۔ صبح اندھیرے منہ نہ اُٹھنے کی سزا بھی بیس کوڑے مقرر ہے ہم غلاموں کے کیبن لکڑی کے لٹھوں سے بنائے جاتے ہیں جن میں کھڑکی او رفرش وغیرہ کا تکلف نہیں ہوتا۔ عموماً بیس فٹ لمبے اور پندرہ فٹ چوڑے کیبن میں دس سے پندرہ تک غلاموں کو رکھا جاتا ہے جبکہ ہر غلام کے لیٹنے کے لئے دس

فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا تختہ فراہم ہوتا ہے۔ صبح کی روشنی نمودار ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ہارن بجتا ہے جس کے دوران تمام غلاموں کو تیار ہونا اور ناشتہ کر کے دوپہر کا کھانا اور پانی اپنی تونبیوں میں بھر کر کھیت پر پہنچنا لازمی ہے۔ صبح کے ساتھ ہی غلاموں کے اوپر خوف کی فضا طاری ہو جاتی ہے۔ دیر سے پہنچنے کا خوف، کام کا مقررہ کوٹہ پورا نہ کر سکنے کا خوف، آخر میں وقت پر کپاس سے بھرا بورا جننگ ہاؤس پر پہنچانے کا خوف۔ کیونکہ ہر کوتاہی کی سزا پندرہ سے بیس کوڑے ہیں۔ غرض رات کے چند گھنٹوں کی نیند کے دوران بھی اسے صرف خوفناک خواب نظر آتے رہتے ہیں۔ کپاس کی چنائی کے دوران غلاموں کے جن معمولات کا بیان کیا گیا وہ ان کے روزمرہ کی زندگی کی سچی تصویر ہے۔ عموماً جنوری کے مہینے کے وسط تک کپاس کی چنائی بہرنوع مکمل کر لی جاتی ہے۔

۱۳

ماسٹر ایپس کی غلامی میں آنے کے اگلے ہی دن اس نے مجھے کلھاڑی کا دستہ بنانے کا حکم دیا، وہاں عموماً دستے کے طور پر کلھاڑی میں ایک ڈنڈا لگانے کا رواج تھا۔ لیکن میں نے اپنے شمالی علاقے میں رائج قدرے ٹیڑھا دستہ بنا کر لگایا جو کارکردگی میں کہیں بہتر تھا۔ ایپس نے اس سے پہلے ایسا دستہ نہ دیکھا تھا اس نے اسے بہت پسند کیا اور بہت دن تک ہر آنے جانے والے کو دکھاتا رہا۔

شروع میں مجھے کپاس کے کھیتوں میں نلائی یعنی فالتو گھاس پھوس کی صفائی پر لگایا گیا اور پھر ان پودوں کی تراش خراش کا کام دیا گیا۔ اس کام کے آخری مرحلے کے قریب مجھے بیماری نے آلیا اور شدید کپکپی کے ساتھ تیز بخار رہنے لگا اور چند ہی روز کے اندر کمزوری اور ناتوانی اتنی بڑھی کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ بخار کی بدحواسی اور سر چکرانے کی وجہ سے ہمہ وقت لرزہ اور چلنے

میں شرابیوں کی سی لڑکھڑاہٹ ہونے لگی۔ عام حالت میں کام کے لحاظ سے میں کبھی اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہیں رہا لیکن اب اُن کا ساتھ دینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ شدید نقاہت کے عالم میں کئی بار کام کے دوران میں زمین پر گر گیا لیکن اُس حالت میں بھی سپروائزر کا تازیانہ میری پیٹھ پر بجلیاں گراتا رہا۔ آخر کار یہ حالت ہوگئی کہ دڑبے بھی کارگر نہ رہے اور ستمبر کے مہینے میں جب کپاس کی چنائی اپنے زوروں پر تھی میں اپنے کیبن سے باہر نکلنے کے قابل بھی نہ رہا لیکن اس وقت تک مجھے نہ تو کوئی دوا ملی نہ ہی مالک اور مالکن نے مجھے لائقِ توجہ سمجھا۔ البتہ بوڑھا باورچی کبھی کبھی مکئی اور سور کی بوٹیاں اُبال کر دے دیتا۔ یہاں تک کہ جب ماسٹر ایپس کو یہ اندازہ ہونے لگا میری موت کی صورت میں اسے سینکڑوں ڈالر کی قیمت کے ایک دو ٹانگوں والے جانور کا نقصان اُٹھانا پڑے گا تو اس نے مجھے قریبی قصبے ہومزول میں ڈاکٹر وائنز کے پاس علاج کے لئے بھیجا۔ ڈاکٹر نے میرے معائنے کے بعد واضح کر دیا کہ مجھے یہاں کی آب وہوا راس نہیں ہے اور اگر مناسب علاج اور پرہیز نہ ہوا تو جان کا خطرہ ہے۔ اس نے گوشت کا استعمال مکمل بند کر کے باقی خوراک کی مقدار بھی نصف کرنے کی ہدایت کر دی۔ بہر حال چند ہفتوں کی کم خوراکی کے نتیجے میں میری بیماری تو کم ہونے لگی لیکن کمزوری اور ناطاقتی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسی دوران ایک صبح ماسٹر ایپس نے مجھ بلا کر کپاس جمع کرنے والی بوری تھما کر کھیتوں کی طرف چنائی کے کام پر جانے کا حکم دیا۔ میرے لئے یہ کام بالکل نیا تھا۔ تجربہ کار غلام تو دونوں ہاتھ سے کپاس کے پھول توڑنے اور بوری میں بھرنے کا کام تیزی اور مہارت سے کر رہے تھے جبکہ میں ایک ہاتھ سے کپاس کا ڈوڈا پکڑتا اور دوسرے ہاتھ سے پھول اتار کر

بوری میں ڈالتا۔ اس طرح میرے کام کی رفتار باقی لوگوں سے آدھی نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ پورے دن کی سخت کوشش کے بعد جب میں اپنا بورا ترازو پر لے کر آیا تو اس کا وزن صرف پچانوے پونڈ یعنی مقررہ وزن، دوسو پونڈ سے کہیں کم تھا یہ دیکھ کر ایپس کو غصہ تو بہت آیا اور اس نے درّوں کی سزا کی دھمکی بھی دے دی لیکن پھر میرے نوآموز ہونے کے پیشِ نظر اُس دن کی معافی مل گئی۔ لیکن اگلے کئی دن تک انتہائی کوشش کے باوجود کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی اور کوڑوں کی سزا سے بھی کوئی بہتر نتیجہ حاصل نہ ہوا تب ماسٹر ایپس نے کپاس کی چنائی کے کام سے نکال کر مجھے لکڑیاں کاٹنے، اکٹھا کرنے اور کپاس کے بورے کھیت سے جننگ فیکٹری تک پہنچانے وغیرہ کے کام پر لگا دیا۔ اس طرح بیماری کے باوجود میری نگرانی کی جاتی رہی کہ کسی حال میں بھی بیکار نہ رہوں۔

میرا مشاہدہ ہے کہ کپاس کی چنائی کے زمانے میں کوئی دن خالی نہیں گیا کہ ایک نہ ایک غلام پر کوڑے نہ پڑے ہوں یہ عمل عموماً شام کے وقت کپاس تولنے کے موقع پر ہوتا۔ جس غلام کی جمع شدہ کپاس مطلوبہ وزن سے کم ہوتی اُسے قطار سے الگ کر کے الٹا لٹا دیا جاتا اور وزن کی کمی کے مطابق درّے لگائے جاتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کپاس کی چنائی کے پورے عرصے کے دوران ماسٹر ایپس کے فارم سے صبح سے رات گئے تک مسلسل درّوں کے زناٹوں اور غلاموں کی چیخوں کی صدائیں سنی جاتی تھیں۔ معمولی غلطیوں مثلاً بورے کے اندر ڈوڈا یا خشک ٹہنی نکل آنے کے معمولی جرم کی سزا پچیس کوڑے جبکہ بیکار کھڑے رہنے پر پچاس اور اپنے نگراں سے لڑنے یا فرار کی کوشش پر دوسو سے پانچ سو تک کوڑوں کی سزا مقرر تھی۔

کپاس کے اس زرعی فارم پر اپنے دو سالہ قیام کے دوران ماسٹر ایپس کا معمول تھا کہ پندرہ دن میں ایک بار وہ ہومزوِل ضرور جاتا اور وہاں سے مکمل طور پر شراب میں دھت واپس آتا۔ اُس وقت اُس پر نیم دیوانگی کی حالت طاری ہوتی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی جو چیز اسے نظر آتی اس کی شامت آجاتی، کراکری ہو یا فرنیچر ہر چیز اُٹھا اُٹھا کر پھینکتا اور توڑنا پھوڑنا شروع کر دیتا پھر کوڑا لہراتے ہوئے باہر نکل آتا۔ ایسے وقت میں غلاموں کو اپنی جان بچانے کی خاطر بہت ہی محتاط رہنا پڑتا۔ سب سے پہلے جو غلام بھی نظر آتا اسے بے قصور ہونے کے باوجود سب سے زیادہ کوڑوں کا مزا چکھنا پڑتا۔ کبھی کبھی جب وہ نسبتاً بہتر موڈ میں واپسی کرتا تو بہت دیر تک پورے صحن میں ناچتا اور اپنی انتہائی بھونڈی آواز میں بے ربط گانے گاتا رہتا۔ میرا سودا کرتے ہوئے شاید ماسٹر ٹائی بڈ نے اسے بتا دیا تھا کہ میں وائلن اچھی بجالیتا ہوں جس پر مسز ایپس نے جو موسیقی میں بہت دلچسپی رکھتی تھیں مجھے خریدنے پر زور دیا تھا۔ اسی لئے اکثر گھر کے اندر میری طلبی ہوتی اور پورے دن کی تھکن کے باوجود خاندان کے سامنے گھنٹوں وائلن بجانا پڑتی۔

اسی طرح جب کبھی ماسٹر ایپس نشے میں دھت رقص کے موڈ میں گھر میں داخل ہوتا تو تمام غلاموں اور کنیزوں کو بڑے ہال میں جمع ہونے کا حکم ملتا خواہ دن یا رات کا کوئی حصہ ہوتا یا ہم سب کام کر کے کتنے ہی تھکے ہوتے ناچ کی محفل سجادی جاتی اور مجھے وائلن شروع کرنے کا اشارہ مل جاتا۔ ساتھ ہی ایپس چیخ کر نعرہ بلند کرتا ''ناچو! کالی چمڑی والو ناچو'' پھر تو دیر کرنے، رکنے یا سُستی دکھانے کا سوال ہی نہ تھا۔ ایپس خود اپنے بے ڈول جسم کے ساتھ تمام غلاموں کے درمیان ہاتھ میں تازیانہ لئے مسلسل پھدکتا رہتا اور سُست پڑنے، یا سانس

لینے کے لئے چند سکنڈ رکنے والے غلام یا کنیز پر مشق جفا شروع کر دیتا۔ البتہ جب وہ خود تھک جاتا تو مختصر سا وقفہ ہو جاتا لیکن ایک دو منٹ کے بعد ہی پھر ”ناچو، حبشیو! تیز تیز ناچو“ کا نعرہ لگتا اور ساتھ ہی میری پیٹھ پر کوڑے کا کچوکا پڑتا۔ اور وائلن کی جھنکار کے ساتھ وہی بے ہنگم رقص جاری ہو جاتا بعض اوقات مسز ایپس اُس چیخم دھاڑ پر ناراض ہو کر اپنے باپ کے گھر چلے جانے کی دھمکی دیتی لیکن اکثر و بیشتر رات کے بالکل آخر حصے تک رقص جاری رہتا اور اس کے باوجود ہمیں آرام کرنے کا موقع دیئے بغیر صبح کی روشنی پھیلتے ہی کھیتوں میں کام پر ہنکا دیا جاتا پھر پورے دن معمول کے مطابق کام لیا جاتا اور کسی قسم کی رعایت نہ ملتی۔ بلکہ اس مستی بھرے رقص و سرود کے بعد ہمارا آقا معمولی غلطیوں پر بھی ہم پر وحشیانہ انداز میں کوڑے برسانے سے دریغ نہ کرتا۔

غرض زندگی کے دس سال بغیر کسی صلے یا تعریف کے ظالم ایڈون ایپس کی خدمت گزاری میں صرف ہو گئے، میری جوانی کے دس قیمتی سال اس کی دولت میں بے پناہ اضافہ کے لئے مجھ سے چھین لئے گئے، ان دس برسوں میں اس کے سامنے اپنا سر جھکائے اور آنکھیں نیچے کیے میں اُس کی ہر زیادتی اور ظلم کو برداشت کرنے پر مجبور رہا۔ اور ان دس برسوں کی خدمت گزاری کے عوض مجھے سوائے تازیانوں اور گالیوں کے کچھ حاصل نہ ہوا۔

خدا کا شکر ہے کہ آج میں اس کے غیر انسانی سلوک سے پناہ حاصل کرنے کے بعد اپنی آزاد سرزمین پر کھڑا ہوں جہاں سر اُٹھا کر اپنے ہم وطنوں سے بات کر سکتا ہوں اور اپنے اوپر کیے گئے مظالم بیان کر سکتا ہوں۔ میں کبھی غلط بیانی یا مبالغے سے کام نہیں لوں گا۔ ماسٹر ایپس کے بارے میں یہ کہنا بالکل

درست ہوگا کہ اس کے دل میں رحم یا انصاف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اکھڑپن، جہالت، بدمزاجی، بے ہودگی اور حد درجہ لالچ اس کے کردار میں مجتمع تھے۔ جس طرح ایک کامیاب سائیس یا جوکی کو گھوڑے سدھانے اور قابو کرنے میں مہارت پر فخر ہوتا ہے اُسی طرح وہ غلاموں کو سیدھا کرنے اور اُن پر پوری طرح حاوی ہو جانے کے ہُنر پر اکثر شیخیاں بگھارتا تھا۔ اس کی نظر میں کالے انسان کی حیثیت ایک منقولہ ملکیت مثلاً گھوڑا، خچر یا کتے وغیرہ سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ میری رہائی اور آزادی کے موقع پر جب یہ واضح کیا گیا کہ میں بھی اسی طرح کا آزاد انسان ہوں اور اس کے اپنے بیوی بچوں کی طرح میرے بھی بیوی بچے ہیں تو وہ غضبناک ہوکر اس قانون کی مخالفت میں بولنے لگا جو ایک کالے کو آزادی کا حقدار گردانتا ہے ساتھ ہی اُس نے قسم کھائی کہ وہ اس شخص کی جان لے لے گا جس نے میرا سراغ لگا کر مجھے اس سے رہائی دلائی۔

یہاں پر میں ماسٹر ایپس سے بھی زیادہ اکھڑ، وحشی اور ظالم شخصیت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جس کا نام جم برنز تھا یہ شخص اپنے کھیتوں میں محض غلام عورتوں سے کاشتکاری کے سارے کام لیتا تھا اور اسے بہت گھمنڈ تھا کہ وہ سیاہ نسل کی عورتوں سے مرد غلاموں کے برابر کام لیتا ہے۔ اُس کے دل میں رحم اور ہمدردی نام کی کوئی چیز نہ تھی اور وہ اپنے غلاموں کے گلّے اور پورے علاقے میں ظلم و جور کے لئے ماسٹر ایپس سے کہیں زیادہ بدنام تھا۔

ماسٹر ایپس نے اس فارم پر کپاس کی کاشت کے ذریعے دو سال میں اتنی دولت کمائی کہ ''بایو بوف'' کے مشرقی کنارے پر اپنا ذاتی زرعی فارم خریدنے کے قابل ہوگیا اور ۱۸۴۵ء کے آخر میں اس پر قبضہ ملنے کے بعد اپنے نو غلاموں

کے ساتھ وہیں جا آباد ہوا۔ سوسن کی موت اور میری آزادی کے بعد اُس کے قبضے میں آج بھی سات غلام ہیں۔ یہ ساتوں غلام یعنی ابرام، وِلّے، فیبی، باب، ہنری، ایڈورڈ اور پیٹسی آٹھ سال تک شب و روز میرے ساتھی اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے۔ یہاں میں ان ساتھیوں کا مختصر سا احوال بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ا......ابرام ساٹھ سال کا ایک طویل القامت شخص تھا وہ ٹینیسی میں پیدا ہوا تھا اور تقریباً چوبیس سال پہلے ایک بردہ فرش نے اُسے جنوبی کیرولینا لا کر ایک بڑے زمیندار جیمز بفورڈ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ جوانی میں چچا ابرام اپنی جفا کشی اور جسمانی قوت کے لئے بڑی شہرت رکھتے تھے لیکن مسلسل کم خوراکی اور شدید جسمانی بیگار اور تشدد نے اُن کے طاقتور جسم کو اب خاصا کمزور کر دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے لئے ایک سرپرست کا درجہ رکھتے تھے اور اکثر ہم سب کو اپنے تجربات اور نصیحتوں سے فیضیاب کیا کرتے تھے۔ گفتگو کے دوران کبھی کبھی وہ اپنے ماضی میں بہت دور نکل جاتے اور اُس دور کو یاد کر کے اُداس ہو جاتے جب وہ نوجوانی میں ایک نام ور اتھیلیٹ تھے بہر نوع اب تو ان کی نظر بھی کمزور ہو چکی تھی اور ساری تیزی طراری غلامی کی چکی میں پیسی جا چکی تھی۔

ب......پینتالیس سالہ وِلّے بھی جنوبی کیرولینا کے ایک جاگیردار ولیم ٹیل کی ملکیت میں تھا جس نے کافی عرصے تک اُس کو اپنی باربرداری کی کشتی چلانے کا کام لینے کے بعد پڑوسی زمیندار بفورڈ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ وِلّے کی بیوی فیبی بفورڈ کی غلامی میں پہلے ہی موجود تھی اور دراصل وِلّے کی خریداری کے لئے فیبی ہی نے اپنے آقا بفورڈ کو آمادہ اور متوجہ کیا تھا۔ بفورڈ ایک

ہمدرد اور نیک دل انسان تھا لہٰذا اس نے فیبی کی درخواست کو قبول کر کے دونوں میاں بیوی کو یکجا کر دیا تھا۔

ج ...... فیبی جس کو ہم سب چچی کہہ کر پکارتے تھے شروع میں ایک بہت ماہر کھیت مزدور سمجھی جاتی تھی لیکن بعد میں اسے باورچی خانے کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ویسے فیبی چچی بڑی تیز، چالاک، بڑبولی اور انتہائی باتونی خاتون تھیں۔ اس کے برعکس وِتے ایک خاموش طبع انسان تھا۔ وہ اپنا کام دل لگا کر خاموشی سے کرتا رہتا، ہاں کبھی کبھی اس تمنا کا اظہار ضرور کرتا کہ کاش وہ ماسٹر ایپس کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک بار پھر اپنے وطن جنوبی کیرولینا چلا جائے۔

د ...... جوان العمر بوب اور ہنری دونوں چچی فیبی کے بیٹے تھے اِن کے والد فیبی کے پہلے شوہر تھے۔ دونوں بچوں کی پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد شوہر اور بیوی میں اختلافات کے نتیجے میں جب جدائی اور طلاق تک نوبت پہنچی تو شوہر نے بیٹوں سے بھی لاتعلقی ظاہر کر کے اُن کو فیبی کے سپرد کر دیا تھا۔ وِتے کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں آنے کے بعد ایڈورڈ پیدا ہوا جو ہمارے زمانے میں لڑکپن کی عمر میں تھا تاہم ماسٹر ایپس نے اسے اپنے گھر میں اپنے چھوٹے بچوں کی خدمت گاری پر رکھا ہوا تھا۔

ہ ...... آخر میں اپنی سب سے مظلوم ساتھی کا ذکر کروں گا۔ وہ تقریباً چوبیس سال کی کشیدہ قامت، پھرتیلی اور مستعد لڑکی پٹیسی تھی۔ انتہائی محنت اور جفاکشی کے کام یا سخت سے سخت سزا برداشت کرنے کے بعد بھی اس کو کبھی پژمردہ نہیں پایا گیا۔ اس کی چُستی اور تیزی طراری کا یہ عالم تھا کہ کھیتوں کی اونچی سے اونچی باڑ وہ ایک جست میں پار کرتی تھی۔ تیز دوڑنے میں شکاری کتے اُس سے

آ گے نہ نکل سکتے تھے۔ کام میں مستعدی کا یہ حال تھا کہ دن بھر کا کام ختم ہونے
کے بعد جتنی دیر میں چچا ابرام اپنا ہیٹ تلاش کرتے تھے اتنی دیر میں پٹیسی اپنے
خچر کو تھان پر باندھتی اُن کا چارہ کاٹ کر اُن کو ڈالتی اور اپنے کیبن میں پہنچ جاتی۔
اسی طرح کپاس کی چنائی کے وقت اس کی انگلیاں بجلی کی طرح حرکت کرتی تھیں
بلاشبہ وہ کھیتوں کی رانی کہلانے کی مستحق تھی۔ پٹیسی اپنی فطرت میں خوش مزاج
،ہنس مکھ، وفادار اور فرمانبردار لڑکی تھی۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ تمام
ساتھیوں میں سب سے زیادہ ظلم وستم اسی پر توڑے جاتے تھے۔ اور اکثر اس کی
پیٹھ تازیانوں سے شگافتہ رہتی تھی۔ حالانکہ نہ تو وہ کام میں کسی سے کم تھی اور نہ اس
کے مزاج میں حکم عدولی یا بغاوت کا عنصر تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ بیک وقت
ایک شہوت پرست مرد اور حسد و رقابت میں مبتلا ایک عورت کی غلامی میں تھی۔
ایک طرف اُسے ماسٹر ایپس کی جنسی خواہشات کا سامنا تھا اور دوسری طرف مسز
ایپس کے ہاتھوں زندگی خطرے میں رہتی۔ کئی کئی دن ماسٹر ایپس کے گھر کے اندر
سخت کشیدگی اور لڑائی جھگڑے کی فضا رہتی جس کا نتیجہ بے گناہ پٹیسی کو بھگتنا پڑتا۔
مسز ایپس کے اصرار اور تاکید کے باوجود جب مالک نے اسے فروخت کر دینے
سے انکار کیا تو مالکہ نے مجھے رشوت کے ذریعے اس کام پر آمادہ کرنا چاہا کہ میں
پٹیسی کو قتل کر کے اس کی لاش کو علاقے کی خطرناک دلدلوں میں دفن کر دوں۔
صورتِ حال یہ تھی کہ اگر وہ مالک کی گھناؤنی خواہش کے خلاف ایک لفظ بولتی تو
اسے شدید تازیانوں کا سامنا ہوتا۔ بصورت دیگر مالکہ اس پر نگاہ رکھتی اور کھیت
کھلیان یا کیبن کے قریب پتھروں یا شیشے کے ٹکڑوں سے اس کا چہرہ زخمی کر دیا
جاتا۔ غرض پٹیسی ایک جنسی درندے اور ایک رقابت وحسد کی شکار عورت کے

درمیان جوروستم میں انتہائی دکھ بھری زندگی گزار رہی تھی۔

ہاں! شاید یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ میرے یہ ساتوں ساتھی ایپس کی غلامی میں آنے سے پہلے ماسٹر بفورڈ کی ملکیت میں تھے جو نسبتاً نرم خو اور رحمدل انسان تھا۔ اُس بہتر دور کو یاد کر کے یہ لوگ آہِ سرد بھرتے تھے کیونکہ اب ان کا سابقہ ایپس جیسے جاہل، تند خو اور ظالم آقا سے پڑا تھا اور یہ صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب مسٹر بفورڈ کاروبار میں نقصان کی وجہ سے بہت مقروض ہو کر مصیبت میں پھنس گئے اور جس کے نتیجے میں ان کو اپنے تمام غلام فروخت کرنا پڑے۔ ماسٹر ایپس جو کافی عرصے تک بفورڈ کا گاڑی بان اور سپروائزر رہ چکا تھا اب زراعت کے کاروبار میں داخل ہونا چاہتا تھا لہٰذا اس نے بفورڈ کی طرف اپنی واجب الادا رقم کے عوض بفورڈ کے غلاموں میں اِن سات افراد کو حاصل کرلیا۔

۱۴

ماسٹر ایپس کی بایو بوف کی طرف منتقلی کے پہلے ہی برس یعنی ۱۸۴۵ء میں علاقے پر ایک بڑی افتاد پڑی عین اس وقت جب کپاس کی فصل تقریباً تیار تھی سُنڈی اور دیگر زرعی کیڑے مکوڑوں نے حملہ کر دیا اور تمام فصلیں مکمل طور پر تباہ ہو گئیں اس صورتِ حال میں آقاؤں کے لئے ان کے غلام بیکار اور غیر مصرف ہو گئے۔ اِسی دوران یہ خبر پھیلی کے خلیج میکسیکو کے ساحلی علاقوں میں گنے کے فارموں پر بہت اچھے معاوضے پر کھیت مزدور درکار ہیں۔ پھر کیا تھا ہمارے آقاؤں نے فی الفور اپنے اپنے غلاموں کے ریوڑوں کو وہاں لے جا کر کرائے پر چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ستمبر کے مہینے میں ایک سو سینتالیس غلاموں کا گلہ تیار کیا گیا جس میں آدھی تعداد عورتوں کی بھی تھی۔ علاقے کے چار گورے زمینداروں کو جن میں ایپس بھی شامل تھا قافلے کی سربراہی سونپی گئی۔ میرے

ساتھیوں میں اس مقصد کے لئے ابرام بوب اور میرا انتخاب کیا گیا مالکوں کے لئے دو گھوڑا گاڑیاں اور کمبلوں و دیگر سامان کے لئے چار گھوڑوں کی بڑی ویگن مہیا ہوئیں جبکہ ہم غلاموں کو تقریباً ایک سو چالیس میل کا یہ سفر پیدل ہی کرنا تھا۔

مقررہ دن دوپہر کے کھانے کے بعد تقریباً دو بجے سہ پہر یہ قافلہ سخت جاں اس ترتیب سے روانہ ہوا کہ سب سے آگے گوروں کی بگھیاں، اُس کے پیچھے اسباب کی ویگن جس کی نگہبانی پر میں مامور تھا پھر غلاموں کی قطاریں اور آخر میں دو گھڑ سوار نگرانی کے لئے متعین کئے گئے تھے۔

تقریباً پندرہ میل چلنے کے بعد پہلی رات کو مسٹر میکرو کے فارم پر پڑاؤ کا حکم ملا۔ گوری چمڑی والے تو اُن کے مکان کے اندر چلے گئے جبکہ ہم سب اپنا اپنا کمبل بچھا کر کھلے آسمان کے نیچے زمین پر لیٹ گئے۔ اگلے دن صبح کی روشنی پھیلنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی تازیانوں کی سنسناہٹ کے ساتھ وہاں سے کوچ کا حکم مل گیا۔ اُس سے اگلی رات ہمیں ایک ایسے کھلے شیڈ کے نیچے ٹھہرایا گیا جس کی ٹین کی چھت تقریباً گل چکی تھی۔ آدھی رات کے بعد انتہائی تیز بارش ہونے لگی جس سے ہمارے کپڑے پانی میں شرابور اور کیچڑ میں لت پت ہو گئے لیکن صبح ہوتے ہی حسب معمول ہمیں سفر جاری رکھنے پر مجبور کیا گیا۔ مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے جب قافلہ سنٹرول پہنچا تو چچا ابرام اور بوب کو ایک زمیندار کرایہ پر لے گیا اسی طرح جوں جوں ہم آگے بڑھتے رہے ہماری تعداد کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ خود میرا نمبر آ گیا اور مجھے خلیج سے چند میل کے فاصلے پر واقع سینٹ میری گنّے کے فارم پر مقررہ کرائے کے عوض ٹرنر نامی زمیندار کے حوالے کر دیا گیا۔ بڑھئی کے کام سے واقفیت کی بناء پر مجھے شروع کے چند روز شکر کے

کارخانے کی مرمت کے کام پر لگایا گیا۔ پھر درانتی ہاتھ میں پکڑا کر چالیس دوسرے غلاموں کے ساتھ گنے کے کھیتوں پر روانہ کر دیا گیا، گنے کی کٹائی میں کپاس کی چنائی جیسا ہُنر درکار نہ تھا لہٰذا میں نے جلد ہی اپنے کام میں مہارت حاصل کر لی۔ کٹائی کا کام ختم ہونے سے پہلے ہی ٹرنر نے مجھے شکر کے کارخانے میں غلاموں کے کام کی نگرانی پر متعین کر دیا۔ کارخانے میں شکر سازی کا کام گنے کی پیلائی سے لے کر شیرہ اُبلنے اور شکر بننے تک دن کے چوبیس گھنٹے مسلسل چلتا رہتا ہے مجھے ایک کوڑا دے دیا گیا کہ میں اسے اُب لوگوں پر بے دردانہ استعمال کروں جو بیکار کھڑے پائے جائیں۔ لیکن اگر میں کوتاہی کا مرتکب ہوں تو میری پیٹھ کو زخمی کرنے کے لئے ایک اور شخص تیار رہتا تھا۔ اس کے علاوہ میری ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ میں مناسب وقت پر کام کرنے والی مختلف ٹولیوں کو کام کے لئے پکار پکار کر بلاتا رہوں ۔ چوبیس گھنٹے چلنے والے اس کارخانے میں مجھے بمشکل ہی سونے کا تھوڑا سا وقت ملتا تھا۔

دوسری ریاستوں کی طرح لوزیانہ میں بھی غلاموں سے اتوار کے دن کام لینے پر کچھ نہ کچھ برائے نام اُجرت ملتی تھی جس سے وہ اپنی سہولت یا ضرورت کی چھوٹی موٹی چیز خریدنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ کیبن میں تو کسی قسم کا فرنیچر، برتن، چمچہ یا چھری وغیرہ مہیا نہیں کی جاتی تھی ۔صرف ایک کمبل اوڑھنے یا بچھانے کے لئے ملتا تھا اور ہفتہ وار راشن رکھنے کے لئے خشک پھل یا سبزی کی کشکول نما تونبی حاصل کر لینے کی اجازت تھی۔ آقاؤں سے پلیٹ یا پتیلی کا سوال کرنے پر غلاموں کو ٹھڈے پڑتے یا طنزیہ جملے سننے کو ملتے۔ گنے کی فصل کے دوران ہفتہ کے ساتوں دن کام ہوتا تھا خصوصاً مجھ جیسے کرائے کے کھیت

مزدوروں کے لئے چھٹی کا کوئی سوال نہ تھا۔ اتواروں کی اس کمائی سے ہم لوگ پلیٹ، چھری یا چمچے وغیرہ خریدتے اور عورتیں کبھی کبھی گھٹیا اور سستی قسم کی چوٹیاں یا ربن خرید کر اپنا نسائی ذوق پورا کرلیتیں۔ ماسٹر ٹرنر کے پاس میں ستمبر سے جنوری تک رہا اور اس دوران اتوار کی کمائی سے میرے پاس دس ڈالر جمع ہوگئے۔ میری تھوڑی بہت کمائی کا ایک اور ذریعہ میرا آزادی کے دور کا ساتھی وائلن تھا۔ جسے بجا کر میں تھوڑی دیر کے لئے دکھ درد بھول جاتا۔ ماسٹر ٹرنر کے فارموں سے کچھ فاصلے پر سینٹرول کے قصبے میں وہاں کے زمیندار نے ایک روز موسیقی کی محفل سجائی جس میں مجھے وائلن بجانے کا حکم دیا گیا۔ اس موقع پر سامعین نے بہت خوش ہو کر کچھ بخشش دی۔ اس طرح میری کل جمع پونجی سترہ ڈالر تک پہنچ گئی اور میں اپنے ساتھیوں میں لکھ پتی سمجھا جانے لگا۔

سینٹ میری کے قریب خلیج میکسیکو میں بڑی کشتیاں اور اسٹیمر چلا کرتے تھے۔ ایک دن باربرداری کا ایک اسٹیمر میرے کھیت سے کچھ فاصلے پر اتفاقاً رک گیا۔ یہ دیکھ کر اچانک میرے دل میں آزادی کی امنگ جاگی اور میں نے اس کے کپتان سے گڑگڑا کر درخواست کی کہ مجھے اسٹور کے ساتھ چھپ کر بیٹھ جانے کی اجازت دیدے۔ دراصل میں نے اپنے ساتھیوں سے اسی طرح ایک غلام کے کامیاب فرار کا قصہ سن رکھا تھا۔ میں نے کپتان کو اپنی طولانی داستانِ غم تو نہیں سنائی البتہ صرف یہ بتایا کہ میں آزاد شہری ہونے کے باوجود جبری غلامی میں مبتلا ہوں اور کسی آزاد ریاست کی طرف فرار کرنا چاہتا ہوں کپتان نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار تو کیا لیکن کہنے لگا نیو آرلین کی بندرگاہ پر کسٹم حکام سے بچنا ممکن نہیں ہے اور پکڑے جانے پر تمہاری گرفتاری کے ساتھ میں بھی سزا سے نہ بچ

سکوں گا اور میرا اسٹیمر بھی ضبط کر لیا جائے گا۔ اس طرح آزادی کی جو کرن میرے دل میں پھوٹی تھی ایک بار پھر یاس اور ناکامی کے اندھیروں میں ڈوب گئی۔

اب گنے کے کارخانوں پر کام ختم ہو رہا تھا چنانچہ اس واقعہ کے اگلے ہی دن ہمارے مالکان سنٹرولِ جمع ہو گئے انہوں نے زمینداروں سے اپنی رقومات وصول کیں اور واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ سینٹ میری سے واپسی پر فیبی چچی نے بتایا کہ ہم لوگوں کی غیر موجودگی میں پٹیسی کے مصائب اور اذیتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ اگرچہ مسز ایپس فطرتاً بدخصلت نہیں تھیں۔ چچا ابرام بتاتے تھے کہ پٹیسی مسز ایپس کے پاس بچپن سے تھی اور اُس کی بہت چہیتی تھی یہاں تک کہ اس کی خوراک میں بسکٹ اور دودھ بھی شامل تھا جس کے بارے میں غلام طبقے کا کوئی فرد سوچ بھی نہیں سکتا لیکن حسد اور رقابت کے شدید جذبے کے تحت اب یہ عالم تھا کہ پٹیسی سے چھٹکارا حاصل کرنے اور ایپس کی نظروں سے دور رکھنے کے لئے وہ اُسے فروخت کر دینے یہاں تک کہ قتل کر دینے پر بھی آمادہ نظر آتی تھیں۔ دوسری طرف اگرچہ ماسٹر ایپس اپنی بیوی کو چاہتا بھی بہت تھا اور اسے خوش بھی رکھنا چاہتا تھا لیکن جنسی ہوس کی وجہ سے پٹیسی سے مستقل جدائی گوارا نہ تھی اُسے معلوم تھا کہ کپاس کے کھیتوں میں پٹیسی کی کارکردگی دو غلاموں کے برابر تھی اور وہ اسے فروخت کر کے مستقل نقصان برداشت پر تیار نہ تھا۔ لہٰذا بیوی کو خوش کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ بیچاری کنیز کو بے گناہی کے جرم میں کوڑے مار مار کر ادھ موا کر دیا جائے جس پر وہ اکثر و بیشتر عمل کر کے اپنی بیوی کی آتشِ حسد کو ٹھنڈا کرتا رہتا۔ اس مسئلے پر بعض اوقات میاں بیوی میں تلخ کلامی ہوتے ہوتے بات اتنی بڑھ جاتی کہ ایپس گالم گلوچ پر اُتر آتا اور مسز ایپس چیخ پکار اور رونا دھونا

شروع کر دیتی۔ ان آوازوں کو سن کر پٹیسی خوف سے کانپنے لگتی کیونکہ وہ سمجھ جاتی کہ اس جھگڑے کے نتیجے میں اس کی پیٹھ تازیانوں سے زخمی ہو کر رہے گی۔ اور انجام کار ہوتا بھی یہی تھا۔

سینٹ میری سے واپسی کے بعد پہلی گرمیاں پڑیں تو ہم غلاموں کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا اور اس کے حل میں میری کارپنٹری کا ہنر کام آیا جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ہمیں ہفتہ بھر کا راشن (اشیاء خوردنی) سنیچر کو ملتا تھا جس میں سور کا گوشت بھی شامل ہوتا تھا۔ گرمیاں آئیں تو تیسرا چوتھا دن گزرنے پر گوشت میں کیڑے پیدا ہو جاتے اور اس کا استعمال ممکن نہ رہتا لیکن ہمارے آقاؤں کو ہماری صحت یا کم خوراکی کا مطلق خیال نہ تھا۔ خوراک کی کمی اور خرابی کا حل اس علاقے کے غلاموں نے خلیج کے قریب دلدلی زمینوں میں کونُ اور پوزم کے شکار کی صورت میں نکالا تھا۔ خرگوش سے ملتے جلتے ان دونوں جانوروں کا گوشت خاصا لذیذ ہوتا ہے۔ تاہم کام ختم کرنے کے بعد رات ہی کو ہمیں شکار کرنے کی اجازت تھی اور چونکہ ہمارے پاس آتشیں اسلحہ تو نہ تھا لہٰذا صرف ڈنڈوں اور کتوں کی مدد سے یہ شکار خاصا تھکا دینے والا تھا جبکہ دن بھر کے کام کے بعد ہم پہلے ہی تھکن سے چور ہوتے۔ اس صورتِ حال میں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے مصداق میں نے مچھلیاں پکڑنے کا ایک انوکھا لکڑی کا جال نما پھندا بنایا۔ میرا کیبن جھیل کی گزرگاہ سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ پانی کی گہرائی کے مطابق تقریباً تین مربع فٹ کا کٹہرا نما یہ پھندا تین طرف سے بند اور صرف ایک طرف سے کھلا تھا۔ اندر کے آخری حصے پر مچھلیوں کی خوراک رکھی جاتی تھی۔ خوراک کے قریب مچھلیوں کے جمع ہو جانے پر داخلے کا دروازہ خود

بخود بند ہو جاتا اور دس پندرہ مچھلیاں آسانی سے پھنس جاتیں۔ اس طرح شکار کی زحمتوں سے بچتے ہوئے میری اور میرے قریبی دوستوں کی گوشت کی ضرورت کسی حد تک پوری ہو جاتی۔

اسی عرصے میں ہمارے علاقے میں دو زمینداروں کے درمیان قتل و خونریزی کی بھیانک واردات ہوئی۔ میرے نزدیک اس واقعہ کا بیان ضروری ہے تاکہ میری داستان پڑھنے والوں کو اُس معاشرے کی صورتِ حال کا اندازہ ہو جس میں اہلِ زر سفید فام آقاؤں کو اپنی انا اور برتری کے لئے ایک دوسرے کا خون بہانے سے بھی دریغ نہ تھا۔

ہماری کیبنوں کے بالمقابل خلیجی گزرگاہ کے پار ماسٹر مارشل کی بڑی جاگیر تھی۔ وہ ریاست لوزیانہ کے بڑے رئیس اور امیر ترین خاندانوں میں سے ایک سمجھے جاتے تھے۔ قریبی قصبے نچز کا ایک شخص ان کے پاس کسی قطعۂ اراضی کی خریداری کے سلسلے میں اکثر آتا، جاتا رہتا تھا۔ ایک دن اُن کے علاقے کی طرف سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور خبر دی کہ مارشل کے ڈیرے پر ایک بڑی خوفناک خونی لڑائی ہو رہی ہے اور اگر فریقین کو جدا نہ کیا گیا تو بڑی تباہ کن صورت بنے گی۔ لوگ مارشل کے گھر کی طرف دوڑے تو وہاں یہ منظر دیکھا کہ کمرے کے فرش پر نچز کے اُس بندے کی لاش پڑی ہے اور ماسٹر مارشل زخمی حالت اور خون آلود کپڑوں میں ہانپتے ہوئے تیز تیز ٹہل رہے ہیں۔ پتا چلا کہ گفتگو کے دوران تنازعہ نے یہ صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن ریاستی قانون کا یہ عالم کہ مسٹر مارشل کی گرفتاری تک نہ ہوئی۔ محض ایک سرسری تفتیشی سماعت ہوئی اور نتیجے کے طور اُن کو بری قرار دیدیا گیا اور اس طرح اُن کے دبدبے میں مزید

اضافہ ہو گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ جوئے کی میز پر میرے آقا مسٹر ایپس اور مسٹر مارشل کے درمیان کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی ایپس کے اکھڑ پن کا تذکرہ تو تفصیل سے ہو چکا ہے۔ گالم گلوچ سے مار پیٹ تک نوبت آنے لگی تو سب نے کیا دیکھا کہ مسٹر مارشل گھوڑے پر سوار ہو کر پستول اور خنجر سے مسلح ہو کر صحن میں آ گئے اور نبرد آزمائی کے لئے چیلنج کرتے ہوئے بولے کہ اگر ایپس نے سامنے آ کر مقابلہ نہ کیا تو اُسے بزدل سمجھ کر کتے کی موت مار دیا جائے گا۔ وہ تو کہئے کہ دونوں کی بیگمات درمیان میں آ گئیں اور معاملات کو ٹھنڈا کر لیا۔ اس طرح کے خونی واقعات پر ان علاقوں میں اکثر سرکاری مداخلت بھی نہیں کی جاتی۔ ہر زمیندار آتشیں اسلحہ اور خنجر سے مسلح دکھائی دیتا اور ذرا سی دیر میں غیر مہذب وحشیوں کی طرح آمادۂ پیکار ہو جاتا۔

مجھے یقین ہے کہ غلامی کے دستور اور غلاموں کے ساتھ ظلم و جور کے سلوک نے وہاں کے گوروں کے مزاج میں وحشت اور بربریت پیدا کر دی ہے۔ روز مرہ کے غیر انسانی سلوک، غلاموں پر مشقِ ستم اور اُن کی آہوں اور کراہوں نے اِن لوگوں کے دلوں سے انسانی اقدار اور رحمدلی و مہربانی کے جذبات ختم کر دیئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب و شرافت اور انسانی جذبات سے عاری بے درد زمینداروں کے اس معاشرے میں ولیم فورڈ (جن کا ذکر گذشتہ کسی باب میں آ چکا ہے) جیسے اہلِ دل بھی ہیں جن کو غلاموں کی حالتِ زار کا احساس بھی ہے اور جو غلاموں کو مخلوقِ خدا اور انسان سمجھتے ہوئے اُن کے دکھ اور مصائب سے لاتعلق نہیں رہتے۔ دراصل غلاموں پر روا اس ظلم و ستم اور بدسلوکی میں محض

آقاؤں کا قصور نہیں بلکہ اُن مروّجہ قوانین اور رواج کی خرابی ہے جس نے انہیں اکھڑ، غیر مہذب اور ظالم بنا دیا ہے۔ وہ بچپن سے دیکھتے ہیں کہ ڈنڈے اور کوڑے کالوں اور غلاموں کے لئے اتنے ہی ضروری ہیں جتنے چوپایوں کے لئے۔ لہٰذا بڑے ہو کر یہ بات اُن کی فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔

۱۵

ماسٹر ایپس کو کپاس کی بہترین کاشت میں بڑی مہارت اور شہرت حاصل تھی تاہم کپاس کی چنائی میں میری عدم مہارت کے پیش نظر گنے کی فصل اور شکرسازی کے زمانے میں وہ مجھے مزدور کے طور پر کرائے پر دوسرے زمینداروں کو دے دیا کرتا تھا جس کے عوض اسے ایک ڈالر روزانہ ملتا تھا۔ گنے کی کٹائی میرے لئے نسبتاً موزوں کام تھا چنانچہ میں نے تین سال مسلسل مسٹر ہاکنز کے گنے کے فارموں اور شوگرمل پر تقریباً ایک سو مزدوروں کے گینگ میں شامل ہو کر نہایت مستعدی سے کام کیا۔

گنے کی کاشت پر جنوری سے اپریل کے دوران کام شروع ہوتا ہے زمین کی تیاری کے بعد اپریل کے مہینے میں گزشتہ فصل کے سالم گنوں سے گانٹھیں نکال کر بوائی شروع کی جاتی ہے اور تقریباً چار ہفتے کے بعد زمین سے انکھوے

پھوٹنے لگتے ہیں۔ اس دوران کھیتوں سے بیکار جڑی بوٹیوں کی صفائی کا کام جاری رہتا ہے۔ ستمبر کے مہینے میں گنّے کی فصل کٹائی کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ گنے کی کٹائی میں میری مہارت اور برق رفتاری کی مالکوں اور مزدوروں میں بڑی شہرت تھی۔ اس کام کے لئے پندرہ انچ لمبی اور تین انچ چوڑی تیز دھار کی درانتی استعمال ہوتی ہے۔ صرف پندرہ بیس دن کے مختصر عرصے میں پوری فصل کی کٹائی اور اکتوبر کا مہینہ شروع ہوتے ہوتے تمام گٹھوں کی شوگر مل پر منتقلی لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اسی لئے گنّے کی کٹائی تمام غلاموں اور کھیت مزدوروں کے درمیان مقابلے اور چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی سے مالکان اُن کی کارکردگی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اس دوران تازیانہ بردار اوورسیر بطور خاص ہر گینگ پر مسلط رہتے ہیں اور رات ہوتے ہوتے کئی جسم کوڑوں کی ضربوں سے شگافتہ دکھائی دینے لگتے ہیں۔

گنّے کی کٹائی ختم ہوتے ہوتے مجھے شوگر مل میں تعینات کر دیا جاتا تھا۔ مسٹر ہاکنز کے کھیتوں اور شوگر مل پر میں نے تین سال نہایت تندہی اور جانفشانی سے کام کر کے شکایت اور سزا کا موقع نہیں دیا۔ اُن کی مل کی چینی اپنے معیار اور سفیدی کے لئے دور ونزدیک مشہور تھی کیونکہ ان کا پلانٹ پورے نیو آرلینز میں اس دور کا جدید ترین پلانٹ مانا جاتا تھا۔

پورے سال کی مسلسل جبری مشقت اور ناروا تشدّد کے دوران صرف کرسمس کی چھٹیاں غلاموں کو قدرے سکون کا موقع فراہم کرتیں۔ مختلف زمینداروں کی طرف سے اُن کے معیارِ سخاوت کے مطابق تین سے چھ دن کی چھٹیاں ملتی تھیں جبکہ ہمارے ماسٹر ایپس کی عملداری میں صرف تین دن کی اجازت ہوتی تھی۔ ان چھٹیوں کا مہینوں پہلے سے انتظار شروع ہو جاتا۔ یہ موقع

جوانوں اور بوڑھوں کے لئے یکساں خوشی کا پیغام لاتا۔ جبکہ چچا ابرام بھی ترنگ میں آجاتے اور پٹیسی بھی اپنے دکھ اور مصائب بھول کر سب کے ساتھ خوشیوں میں شریک ہو جاتی۔ یہ مختصر عرصہ موج میلہ کرنے اور ناچ گانے میں گزرتا۔ یہی وہ موقع ہوتا جب غلاموں کو بھی مختصر مدت کے لئے محدود قسم کی آزادی مل جاتی کہ وہ بھی اپنے طور پر کرسمس منا سکیں۔

علاقے کے رواج کے مطابق ہر سال زمینداروں میں سے کسی ایک طرف سے باری باری اپنے اور تمام پڑوسی زمینداروں کے غلاموں کو ازراہِ غریب پروری کرسمس کا بڑا کھانا دیا جاتا۔ مثلاً ایک سال مسٹر مارشل کی طرف سے کھانے کا اہتمام ہوتا تو دوسرے سال ماسٹر ایپس اور تیسرے سال مسٹر ہاکنز کو یہ اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح پورے علاقے سے تقریباً پانچ سو لوگوں کا اجتماع ہو جاتا بیشتر لوگ پیدل اور کچھ بیل گاڑیوں اور خچروں پر سوار دور و نزدیک سے اس دعوت میں شریک ہوتے۔ مثلاً چچا ابرام کو ضعیف العمری کی باعث سواری کے لئے جو خچر ملتا وہ اسی پر چچی، فیب اور پٹیسی کو بٹھا کر شرکت کرتے۔ اس موقع کے لئے سب لوگ خصوصی تیاری کرتے۔ ایک آدھ دن پہلے سے کپڑے دھو کر تیار رکھے جاتے۔ جلی ہوئی موم بتی کے ٹکڑے سے جوتوں کو چمکایا جاتا اور اگر کسی کو ہیٹ میسر ہوتا تو ترچھے انداز میں پہن کر بانکوں کی طرح نکلتا۔ عورتوں کے سر پر رومال ضرور ہوتا اور دوشیزائیں سرخ رومال یا سرخ ربن کا اہتمام ضرور کرتیں۔ کھانے کی میزیں کھلے میدان میں لگائی جاتیں۔ سال بھر میں یہی ایک موقع ہوتا کہ جب کالوں کو اُن کی معمولی خوراک (کارن اور سور کے گوشت کے خشک ٹکڑوں) کے بجائے پھل، سبزیاں، پرندوں اور گائے

بکرے کا بھنا گوشت نصیب ہوتا۔ یہ کھانے باورچی خانوں کے بجائے عموماً میدان میں گڑھے کھود کر اور لکڑیوں کی آگ پر پکائے جاتے۔ جب آگ جل کر انگاروں کی صورت اختیار کر لیتی تو ان پر مرغیاں، مرغابیاں، ٹرکی یہاں تک کہ سور اور بکرے بھی بھونے جاتے۔ اس کے علاوہ میٹھے کے طور پر پیسٹریاں اور میٹھے سموسے فراہم کئے جاتے۔ ان کھانوں کے ساتھ انصاف تو صرف غلام ہی کرتے البتہ گوروں کی بڑی تعداد ان کے کھانے کی رفتار اور مقدار کو دیکھ کر لطف اندوز ہونے کے لئے جمع ہو جاتے۔ کھانے کے بعد کرسمس رقص کا اہتمام ہوتا۔ اس جشن کے موقع میرا کام ہمیشہ وائلن بجانا ہوتا تھا۔ یوں تو افریقن قوم موسیقی سے خصوصی لگاؤ رکھتی ہے اور میرے ساتھیوں میں کئی ایک بینجو پر میری سنگت بہترین طریقے پر کرتے لیکن وائلن نوازی میں میری شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی میرے مالک کو گاہے گاہے گوروں کے خطوط ملتے جس میں ان کی رقص و سرود کی محفلوں میں وائلن بجانے کے لئے مجھے بھیجنے کی درخواست کی جاتی۔ وہ مجھے بھیج کر اپنا پورا معاوضہ وصول کرتا البتہ اچھی پرفارمنس پر مجھے بھی چند سکے بخشش کے طور پر مل جاتے۔ اس طرح مجھے عام لوگ پہچاننے لگے تھے اور اکثر راستہ چلتے لوگ خصوصاً نوجوان طبقہ مجھے روک کر اِدھر اُدھر کے سوالات کر کے اپنا دل خوش کرتا۔ میں سوچتا ہوں اگر یہ وائلن میرا ساتھی نہ ہوتا تو غلامی کے یہ طویل بارہ برس کیسے گزرتے۔ اِس کی وجہ سے میں آقاؤں کے گھروں میں متعارف ہوا۔ اس کے ذریعے میں دن بھر کی شدید مشقت کو بھلانے کے قابل ہو جاتا۔ اسی کے ذریعے حاصل ہونے والی قلیل بخششوں سے کبھی کبھی میری تمباکو نوشی کا شوق پورا ہو جاتا اور مجھے نئے کپڑے اور جوتے مہیا ہو جاتے۔ اکثر آدھی رات کو

جب نیند مجھ سے روٹھ جاتی اور جب میری روح اپنے مقدر کی خرابی اور اپنے بچوں کی بے پدری پر بے چین ہونے لگتی تو اسی وائلن کی دھنیں مجھے سکون دیتیں۔ کرسمس کی چھٹیوں کے دوران میں اکثر نہر کے کسی ویران کنارے پر جا کر گھنٹوں تنہائی میں اس کے ذریعے اپنا غم غلط کرتا۔

ایسے ہی ایک کرسمس کے موقعہ پر مجھے یاد پڑتا ہے کہ رقص شروع ہونے پر فلور پر بہت سے جوڑوں کے ساتھ مس لائیولی (lively) اور سام بھی نمودار ہوئے۔ یہ بات مشہور تھی کہ لائیولی کے لئے سام کے دل میں پیار کا نازک جذبہ موجود ہے جبکہ مارشل کا بیٹا پیٹ اور کیری کا لڑکا ہیری بھی اُس کے عاشقوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ دراصل لائیولی اس قسم کا اسکینڈلوں کے لئے کسی حد تک بدنام تھی۔ سام کے دونوں رقیب لائیولی کو سام کی بانہوں دیکھ کر غضبناک تو ہوئے لیکن یہ موقع دنگا فساد کا نہیں تھا، اس لئے وہ اگلے راونڈ کے منتظر رہے لیکن سام اور لولی نے رقص میں اپنی مہارت اور تیزی کا وہ ہنر پیش کیا کہ ناظرین نے مسلسل مکرّر مکرّر کے نعرے لگائے اور ان کو ہم رقص رہنے پر اصرار کرتے رہے تا آنکہ صبح نمودار ہونے پر رقص کا وقت اختتام کو پہنچا اور تمام لوگ اِس جوڑے کی لگن، توانائی اور سکت پر عش عش کر اُٹھے۔ محفل کے آخر میں تیز دھنوں پر کورس کی صورت میں گانوں کا آئٹم شروع ہوتا تو کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ اس وقت غلام برادری اپنے اندر کے تمام دکھ درد نکال باہر کردے گی۔ بالآخر سورج نکلنے پر رقص و موسیقی کی یہ محفل ختم ہو جاتی۔

کرسمس کی چھٹیوں کے باقی دن جو لوگ کھیتوں پر کام کرنا چاہتے اُن کو اس کا معاوضہ ملتا اور جو کسی سے ملنے یا کہیں گھومنے جانا چاہتے ان کو مقررہ اور

محدود فاصلے تک جانے کے لئے پاس جاری کر دئے جاتے۔ لیکن دیکھا یہی گیا ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس دوران میں کام کرنا پسند کرتے کیونکہ انہی تین دن کے لئے تو اُن کو جبر و ظلم اور دُرّوں کے خوف سے نجات ملتی ورنہ تین سو باسٹھ دن تو انہیں جانوروں کی طرح تشدّد کا سامنا رہتا تھا۔

کرسمس کی انہیں تعطیلات میں غلاموں کو شادیاں رچانے کا موقع بھی دیا جاتا ہے جس کے لئے زن و شوہر کے آقاؤں کی اجازت بنیادی شرط ہوتی ہے۔ اگر بیوی اور شوہر ایک ہی آقا کی ملکیت نہیں ہوتے تو شوہر کو ہر سنیچر کی رات بیوی کے پاس جانے کی اجازت ہوتی ہے لیکن اگر فاصلہ زیادہ ہو تو پندرہ دن میں ایک بار یہ اجازت ملتی ہے۔

۱۶

ہر سال گنے کی کٹائی کے موسم اور سینٹ میری کے ایک دورے کے علاوہ میں دس سال تک ماسٹر ایپس کے اپنے زمیندارے ہی میں کام پر متعین رہا۔

نسبتاً چھوٹی زمینداری اور کم نفری کی وجہ سے اس نے کوئی اوورسیر نہیں رکھا ہوا تھا بلکہ یہ سخت گیر فریضہ وہ خود ہی انجام دیتا تھا البتہ کپاس کی چنائی کے دوران اس کام پر کسی کو عارضی طور پر رکھ لیتا تھا۔ بڑی زمینداریوں میں جہاں سو ڈیڑھ سو غلام یا کھیت مزدور ہوتے ایک اوورسیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ اوورسیر عموماً گورے ہوتے ہیں جن کی تحویل میں ایک پستول ایک خنجر اور سواری کے لئے ایک گھوڑے کے علاوہ چند کتے دئے جاتے ہیں۔ اِن کا کام غلاموں اور مزدوروں کی کڑی نگرانی کرنا ہوتا ہے۔ اِن اوورسیرز کی سب سے بڑی صلاحیت

اُن کی بے رحمی سخت گیری اور بیدردی سمجھی جاتی ہے اور غلاموں سے زیادہ سے زیادہ کام نکلوانا ان کی اصل اور بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کتوں کی موجودگی اُن غلاموں کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے جو بھاگنے کی کوشش کریں یا تھک کر یا بیہوش ہو کر گر پڑیں۔ ہنگامی حالت میں انہیں پستول استعمال کرنے کی بھی اجازت ہوتی ہے چنانچہ ایک آدھ ایسے واقعات بھی ہوئے جب جبر و تشدد کے دوران تنگ آکر سیاہ فام غلام جوابی کاروائی پر اتر آئے۔ پچھلے سال جنوری کے مہینے میں مارکس وِل میں ایک غلام کو اپنے اوورسیر کو ہلاک کر دینے کے جرم میں پھانسی چڑھا دیا گیا تھا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ غلام کو لکڑی کے تختے تیار کرنے کا کام دیا گیا۔ کام کے دوران اوورسیر نے اسے کہیں دوسرے مقام پر ایک پیغام پہنچانے کے لئے بھیجا جس میں کافی وقت صرف ہو گیا اور نتیجتاً اس روز کام کا مقررہ کوٹا پورا نہ ہو سکا۔ اگلے دن اوورسیر کم کام کرنے کی سزا دینے پر آمادہ ہو گیا۔ غلام نے پیغام رسانی کا عذر پیش کیا لیکن اوورسیر نے عذر مسترد کرتے ہوئے پیٹھ پر سے کپڑے اُتار کر اوندھے لیٹنے کا حکم دے دیا تاکہ دُرّے برسائے جائیں۔ اتفاق سے اُس وقت وہاں کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔ غلام نے حکم کی تعمیل تو کر دی لیکن جب کافی دیر تک اوورسیر کا ہاتھ نہ رکا تو ناانصافی اور تکلیف سے حواس باختہ ہو کر غلام ایک بار اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اضطراب کے عالم میں قریب پڑی کلھاڑی اُٹھا کر اوورسیر کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ اِس کے بعد نہ تو اس نے فرار کی کوشش کی اور نہ غلط بیانی سے کام لیا بلکہ اپنے مالک کو تمام واقعہ سچ سچ بتا دیا اور ہر قسم کی سزا بھگتنے پر آمادہ ہو گیا۔ انجام کار اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

اوورسیروں کے ماتحت مزدوروں اور غلاموں کی نفری کی مناسبت سے

چند تنومند سیاہ فاموں کو ہانکا مقرر کیا جاتا ہے جنہیں وہاں ڈرائیور کہتے ہیں۔ اپنے معمول کے کام کے ساتھ ان ہانکوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اگر کوئی غلام بیکار یا کام سے غافل ہو تو کوڑے لگا کر ہشیار کر دیں۔ ہانکوں کی اپنی غفلت انہیں خوداوورسیرز کی سزا سے نہیں بچاسکتی۔ کبھی کبھی شدید مشقت اور گرمی کی شدت سے اگر کوئی غلام بیہوش ہو کر گر پڑے تو ہانکے کا کام یہ ہوتا ہے کہ اسے گھسیٹ کر سائے میں لاکر اس پر ایک آدھ بالٹی پانی ڈالے اور اسے پھر مشقت جاری رکھنے پر مجبور کرے۔

سینٹ میری سے واپسی کے بعد ایپس نے اپنے کھیتوں پر کام کے دوران مجھے مستقل طور پر اپنے گینگ کا ہانکا مقرر کر دیا جب کہ وہ خوداوورسیر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے ساتھ یہ انتہائی ناخوشگوار فریضہ تھا جو مجھے تقریباً آٹھ سال ادا کرنا پڑا۔ تمام دن گردن میں درّہ لٹکائے مجھے اپنے ساتھیوں کا پیچھا کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن میں معمولی سی نرمی بھی اختیار کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ ایپس کھیتوں کے اندر ہو یا باہر اُس کی آنکھیں ہم لوگوں کا پیچھا کرتی رہتیں۔ مکان کی راہداریوں سے درختوں کے جھنڈ سے یا کسی بھی آڑ والی جگہ سے وہ سارا وقت ہم پر نظر رکھتا اور کام میں تھوڑی سی سُستی دیکھ کر وہ نہ صرف متعلقہ غلام کو سزا دیتا بلکہ میری چمڑی بھی کوڑوں کی زد میں آجاتی۔ ہاں مجھے اپنے ساتھیوں پر تازیانے برساتے دیکھ کر اسے بہت مسرت ہوتی تھی لیکن پھر ہم نے بھی اس کا حل نکالا۔ اگر وہ کچھ فاصلے پر ہوتا تو میں وقفے وقفے سے کوڑے کو لہرا کر پٹاخوں کی سی آواز پیدا کرتا اور متعلقہ غلام خصوصاً پٹیسی یہاں تک کہ چچا ابرام بھی مصنوعی چیخیں اور پُر درد آہیں بلند کر دیتے۔ یہ چیز ایپس کے

جذبۂ حیوانی کے لئے بڑے سکون اور اطمینان کا باعث ہوتی۔ اسی طرح غلاموں سے میری سختی اور ظلم کی شکایت سن کر اسے عین مسرت حاصل ہوتی۔ نشے کی حالت میں تو وہ جامۂ انسانی سے بالکل باہر ہو جاتا اور غلاموں کے قتل تک پر آمادہ ہو جاتا۔

اسی طرح کی صورتِ حال ایک دن اس وقت پیدا ہوئی جب ایپس ایک شوٹنگ میچ کے سلسلے میں ہومزول گیا ہوا تھا، جہاں سے شام تک اس کی واپسی کا امکان نہ تھا لیکن دوپہر کے قریب اچانک پٹیسے نے کھیت میں کھرپی چلاتے ہوئے گھبرائے ہوئے انداز میں سرگوشی سے بتایا کہ ایپس قریبی جھاڑیوں میں چھپا اُسے (پٹیسی کو) بلا رہا ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں سمجھ گیا کہ یقیناً وہ نشے میں دُھت ہے اور اس وقت اس پر جنسی بھوت سوار ہے۔ پٹیسی رونے لگی تو میں نے آہستہ سے کہا کہ وہ اپنا کام جاری رکھے اور ادھر توجہ ہی نہ دے۔ ایپس نے میری سرگوشی دیکھ لی وہ غصہ اور نشے میں لڑکھڑاتا ہوا میری طرف بڑھا اور گالی دیتے ہوئے کہا ''تو نے پٹیسے سے کیا بولا؟'' میں نے مہمل سا جواب دے کر ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن وہ تو آگ بگولا ہو گیا اور یہ کہتے ہوئے میرا گریبان پکڑ لیا ''کالے انسان! تو کب سے اس فارم کا مالک بن بیٹھا'' ساتھ ہی دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر بڑا چاقو نکال لیا اور خباثت بھرے لہجے میں بولا'' آج میں تیری سیاہ گردن سر سے جدا کر کے رہوں گا'' ایک ہاتھ سے تو چاقو کھل نہ سکتا تھا لہٰذا اس نے دانتوں سے کھولنا چاہا۔ جان بچانے کا آخری موقع جان کر میں نے زور کا جھٹکا دیا اور اچھل کر بھاگنا شروع کر دیا۔ کھلے چاقو کے ساتھ وہ میرے پیچھے دوڑا لیکن نشے کے عالم میں وہ مجھے کب پکڑ سکتا تھا۔ میں نے اسے کھیت کے دو تین

چکر لگوائے تو وہ تھک کر بیٹھ گیا اور صلح جُوئی کے انداز میں مجھے قریب بلانے لگا۔ میں خطرہ کیوں مول لیتا۔ اسی دوران میں نے دیکھا مالکن کھیت کی باڑ کے نزدیک کھڑی اس منظر کو مذاق اور چوہے بلی کی دوڑ سمجھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی ،اس پر نظر پڑتے ہی ایپس نے میرا تو پیچھا کرنا بند کر دیا اور کھیت ہی میں ٹھہر گیا جبکہ میں اپنی عافیت کی خاطر دوڑتے ہوئے مالکن کے پاس پہنچ گیا اور اس کے پوچھے بغیر تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جسے سن کر وہ بھڑک اُٹھی اور چیخ چیخ کر بیک وقت اپنے شوہر اور پٹیسی کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایپس سنجیدہ اور معصوم صورت بنائے کمر پر ہاتھ باندھے چلا آ رہا ہے۔ قریب پہنچنے پر مسز ایپس نے گھناؤنے خطابات دیتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کس جرم میں تم اس کا گلا کاٹنے پر آمادہ تھے، جواب میں اس نے انتہائی ڈھٹائی سے تمام بزرگانِ دین کی قسمیں کھا کر یہ کہتے ہوئے مجھے صاف جھٹلا دیا کہ ''اس سے تو آج میں نے بات ہی نہیں کی'' اور پھر مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ''کیوں رے جھوٹے حبشی! میں نے کب تجھ سے بات کی'' اب کسی غلام میں اتنی جرأت کہاں کہ آقا کے آگے ایسا سچ بولے جو اسے جھوٹا بنا سکے چنانچہ میں گردن جھکا کر خاموش رہا جس پر وہ تو بیگم کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا اور میں کھیت پر واپس آ کر مشقت پر لگ گیا۔ اس واقعہ کا پھر کبھی تذکرہ بھی نہ آیا کہ کس طرح ایک بے گناہ انسان کی گردن کٹنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔

مجھے خریدتے وقت ماسٹر ایپس نے پوچھ لیا تھا کہ مجھے لکھنا پڑھنا تو نہیں آتا اور یہ بتانے پر کہ میں نے تھوڑی سی تعلیم حاصل کی ہے اس نے مجھ پر بخوبی واضح کر دیا تھا کہ اگر اس نے کبھی مجھے کوئی کتاب یا قلم دوات پکڑے ہوئے دیکھ

لیا تو دُرّوں کی سزا بھگتنا ہو گی۔ اُس نے کہا تھا کہ مجھے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ وہ کالے غلاموں کو کام اور مشقت کے لئے خریدتا ہے ان کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے نہیں۔ اس کے علاوہ اس نے کبھی مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا، کیونکہ وہ غلاموں سے کام کے علاوہ کوئی اور بات کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔

اب میری غلامی کا عرصہ نویں سال میں داخل ہو رہا تھا لیکن فرار اور آزادی کی تمنا ختم نہ ہوئی تھی۔ ان دنوں میں ایک بار پھر کسی طرح ڈاک کے ذریعے اپنے خاندان یا شمالی ریاستوں میں اپنے کسی دوست کو خط لکھ کر حالات سے آگاہ کرنے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا لیکن اس سلسلے میں حائل دشواریوں کا اندازہ اُس شخص کو نہیں ہو سکتا جو مجھ پر عائد پابندیوں سے آگاہ نہ ہو۔ اوّل تو میری کاغذ قلم اور دوات تک رسائی ہی ناممکن تھی۔ دوسرے یہ کہ نہ تو کسی غلام کو پاس کے بغیر مالک کے فارموں سے باہر جانے کی اجازت تھی اور نہ ہی کوئی پوسٹ ماسٹر کسی غلام کو اُس کے آقا کی تحریری اجازت کے بغیر ڈاک کا لفافہ دے سکتا تھا۔ بہر حال سب سے پہلے تو ایک شیٹ کاغذ کا حصول اس طرح ممکن ہوا کہ اگلی سردیوں میں جب ماسٹر ایپس کپاس کی فروخت کے لئے نیو آرلین گیا ہوا تھا ایک دن مالکن نے مجھے ہومزول بھیجا اور دیگر سامان کے ساتھ فل اسکیپ کاغذوں کا دستہ بھی منگوایا۔ پھر کیا تھا میں نے ایک شیٹ چُرا کر کیبن میں اپنے سونے کے تختے کے نیچے چھپا دی۔ اس کے بعد کئی تجربوں کے نتیجے میں پیپل کی چھال کو اُبال اُبال کر روشنائی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر تو مرغابی کے پر سے قلم کا کام لینا کوئی مشکل نہ تھا۔ رات کے وقت جب کیبن کے سب لوگ سو جاتے

تو کوئلوں کی مدھم روشنی میں اپنے تختے پر لیٹ کر میں اپنی داستانِ غم لکھتا رہتا اس طرح کئی رت جگوں کے بعد میں نے اسے مکتوب کی شکل میں مکمل کر لیا لیکن یہ تحریر بھی ایک عرصے تک تختے کے نیچے پڑی رہی کہ اسے حوالۂ ڈاک کرنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ اِسی دوران آر مزبی نام کا ایک غریب سا گورا اوورسیری کی ملازمت تلاش کرتا ہوا ہمارے علاقے میں پہنچا۔ ماسٹر ایپس کے پاس تو غلاموں کی نفری کم ہونے کے سبب اوورسیر کی ضرورت ہی نہ تھی البتہ پڑوس کے زمیندار مسٹر شا نے اسے اپنے ہاں رکھ لیا لیکن جیسا کہ مسٹر شا اپنے تلّون مزاجی کیلئے بدنام تھے انہوں نے دو ہفتوں کے بعد ہی آر مزبی سے کہا میرے ہاں اوورسیری کا کام نہیں ہے البتہ محض مزارع کے طور پر کام کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ اگرچہ گوری چمڑی والے تو غلام کاشتکاروں کے ساتھ کام کرنا اپنی تذلیل و توہین سمجھتے تھے لیکن اپنی کسی انتہائی مجبوری کے تحت آر مزبی نے کھیت مزدور کی نوکری بھی منظور کر لی۔ میرے اور آر مزبی کے کھیت بالکل متصل تھے لہٰذا میں نے اُس کے ساتھ اس خیال سے تعلقات بڑھانے شروع کئے کہ شاید وہ میرا خط پوسٹ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ میں اس سے بہت عزت سے پیش آتا اور موقع نکال کر کام میں بھی مدد کر دیتا۔ اس طرح میں نے اس کا اعتماد اور قربت حاصل کر لی۔ وہ ہفتے عشرے میں ایک بار مارکس وِل ضرور جاتا تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے جب ساری دنیا محوِ خواب تھی میں اپنے کیبن سے خاموشی سے نکل کر آر مزبی کے پاس آیا اور اس سے رازداری کے ساتھ خط پوسٹ کرنے کی درخواست کی۔ ساتھ ہی اس مہربانی کے عوض اپنی کُل پونجی جو وائلن نوازی سے جمع ہوئی تھی اُسے نذر کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے رازداری سے کام کر دینے کا

وعدہ کرلیا۔ اُس وقت اگرچہ خط بھی میری جیب میں موجود تھا لیکن میں نے خطرہ کے امکان کے تحت اور مزید ایک دن اعتماد آزمانے کے لئے اگلی رات خط دینے کا پروگرام بنایا اور اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ بقیہ ساری رات میں اس خیال سے سو نہ سکا کہ میں نے کتنا بڑا خطرہ مول لے لیا ہے کیونکہ یہ خط میرے لئے موت کا پروانہ بھی بن سکتا ہے۔

میرا شک درست ثابت ہوا اگلے دن جس وقت کپاس کی صفائی کا کام ہو رہا تھا اور ماسٹر ایپس اپنے اور مسٹر شا کے کھیتوں کی منڈیر پر بیٹھا کام کی نگرانی کر رہا تھا اچانک آرمزبی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور تقریباً دو گھنٹے دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ یہ منظر میرے لئے انتہائی کربناک تھا۔ غرض رات ہونے پر ماسٹر ایپس ہاتھ میں درّہ تھامے میرے کیبن میں داخل ہوا اور بولا۔ ''مجھے آج پتہ چلا کہ میرے پاس ایسا تعلیم یافتہ حبشی غلام بھی ہے جو خطوط تحریر کرتا ہے اور اپنے گورے ساتھیوں کی معرفت ان کو پوسٹ کروانا چاہتا ہے۔ پلیٹ! تو، تو اُسے خوب جانتا ہوگا''

یہ سن کر میرے ہاتھوں پیروں سے جان سی نکلنے لگی لیکن پھر جان بچانے کی ایک ہی صورت سمجھ میں آئی اور میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں میرے آقا! میں ایسے شخص یا ایسی بات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' ''کیا تو گزشتہ رات مسٹر شا کے ڈیرے پر نہیں تھا؟'' اس نے غضبناک آواز میں سوال کیا ''اور آرمزبی سے خط پوسٹ کرنے کی درخواست نہیں کی'' میں نے جواب دیا

''بالکل نہیں میرے مالک! میں نے زندگی بھر ایسی کوئی بات نہیں کی۔ آرمزبی کی بات بالکل جھوٹی ہے میں بغیر کاغذ اور دوات کے خط کیسے لکھ سکتا

ہوں۔ اور میں تو پاس لے کر بھی کبھی کھیتوں سے باہر نہیں نکلا۔ میں آر مزبی کی سازش سمجھ سکتا ہوں۔ اُس نے آپ سے ملازمت کی درخواست کی تھی جو آپ نے منظور نہ کی۔ دراصل وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ آپ کے سب غلام بھاگنے والے ہیں اسی لئے ہم پر ایک سخت گیراوورسیر ضروری ہے۔ جناب آپ یقین کریں کہ وہ پکا جھوٹا ہے اور اس کا مقصد صرف نوکری کا حصول ہے۔''

میری باتوں سے وہ کسی حد تک متاثر ہو کر کہنے لگا'' پلیٹ! میں تجھے سچا تو نہیں سمجھتا۔ لیکن آر مزبی بھی مجھے بے وقوف بنا کر نوکری حاصل نہیں کر سکتا۔ اور میں اپنے غلاموں کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے وہ میرے کیبن سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ خط کو بستر کے نیچے سے نکال کر آگ کی نذر کر دیا اور پھر سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے مقدر کی خرابی پر غور کرنے لگا کہ شائد اب رہائی اور نجات کی کوئی صورت نہیں رہ گئی اور میری جوانی اسی طرح غلامی کی نذر ہو جائے گی۔ اس کے بعد تو میں خود کو بوڑھا اور کمزور بھی محسوس کرنے لگا کیونکہ کبھی کبھی مجھے گمان ہوتا کہ میں اسی غلامی کی حالت میں ایک دن قبر میں اُتر جاؤں گا اور میرے خاندان کو اس کا علم تک نہ ہونے پائے گا۔ لیکن آزادی کی ایک فطری خواہش مجھے بار بار جد و جہد اور مزاحمت پر آمادہ کر دیتی تھی۔

بہر حال اس واقعہ کے چند روز بعد ہی آر مزبی کو ماسٹر شا نے بھی نکال باہر کیا اور اس طرح یہ خطرہ ہمیشہ کے لئے میرے سر سے ٹل گیا۔

۱۷

مجھے تشدد اور غلامی کی چکی میں پستے ہوئے اب ۱۸۵۰ء کا سال آ گیا تھا۔ میرے ایک ساتھی وِلے کے لئے یہ انتہائی دکھوں اور مصیبتوں کا سال ثابت ہوا۔ وِلے چچی فیبی کا شوہر اور ایک خاموش طبع انسان تھا۔ اسے صرف اپنے کام سے کام رہتا جس کے دوران کسی نے اس کو کبھی بر بڑاتے یا شکایت کرتے نہیں سنا لیکن اُس کی ایک خراب عادت تھی کہ اکثر رات گہری ہونے پر وہ پڑوس کے کسی زمیندارے میں بغیر پاس حاصل کئے اپنے دوستوں کی محفلوں میں ضرور جاتا۔ چچا ابرام اور اس کی بیوی فیبی اس بدعنوانی پر اس کو اکثر ٹوکتے لیکن اس نے ان کی فہمائش پر کبھی کان نہ دھرے۔ نہ معلوم ان محفلوں میں اس کے لئے کیا دلچسپی تھی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا اور جب اکثر وہیں صبح ہو جاتی تو ہارن بجنے سے پہلے اپنے کیبن تک پہنچنے کے لئے اسے بہت تیز رفتاری سے دوڑنا

پڑتا۔ دوسرے علاقوں کے بارے میں تو مجھے علم نہیں ہے لیکن بایوبوف میں زمینداروں نے ایسے گشتی دستے قائم کرر کھے تھے جن کا کام مختلف فارموں کے درمیان بغیر کسی پاس کے چلتے پھرتے غلاموں کو پکڑنا، کوڑے لگانا اوران کے مالکوں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ گھڑسواروں کا یہ مسلح دستہ شکاری کتوں کے ہمراہ دن رات گشت پر رہتا تھااورانہیں فرار کی کوشش کرنے والے غلاموں کوشوٹ کر دینے تک کا اختیار حاصل تھا۔ ایک دن واپسی میں اپنے فارم کی طرف دوڑتے ہوئے وِلے کی مڈ بھیڑ ایک ایسے ہی گشتی دستے سے ہوگئی اُسے اپنے تیز دوڑنے پر بہت ناز تھا اس نے سمجھا کہ پکڑے جانے سے پہلے دوڑ کر اپنے کیبن میں داخل ہو جائے گا لیکن ایک خونخوار تنومند اور تیز رفتار کتے نے اس کی ٹانگ کو گرفت میں لے لیا۔ پھر کیا تھا۔ پہلے تو دستے کے افراد نے درّوں سے اس کی اچھی خبر لی اور پھر گرفتار کر کے ایپس کے سامنے پیش کر دیا۔ کتے کی بھنبھوڑ اور درّوں کی ضربوں سے زخمی حالت کے باوجود ایپس نے ایک بار پھر انتہائی بے رحمی سے اس پر کوڑوں کی بارش کردی۔ جس کے نتیجے میں اُس کا سارا جسم سوج کر کُپا ہو گیا اور وہ ہلنے جلنے کے قابل بھی نہ رہا لیکن اس کے باوجود اُس کو کھیتوں پر مشقت کے لئے بھیج دیا گیا۔ یہ بے رحمانہ اور غیر انسانی سلوک اب اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا لہٰذا اس نے فرار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اوراگلے اتوار کواپنی بیوی تک کو بتائے بغیر صبح سویرے جبکہ ابھی اسکے ساتھی سو کر بھی نہ اُٹھے تھے اپنے ہفتہ بھر کے راشن کے ساتھ کیبن سے غائب ہو گیا۔

صبح ہونے پر جب وِلے نظر نہ آیا تو کھلبلی مچ گئی۔ تمام کیبنوں غلّے اور کپاس کے گوداموں، غرض ہر ہر جگہ کی تلاشی لی گئی۔ غلاموں کو بلا بلا کراور

دھمکیاں دے کر تفتیش کی گئی۔ ایپس غیض وغضب کے عالم میں گھوڑے پر سوار ہو کر قرب و جوار کے تمام کھیتوں اور فارموں سے پتا کرتا پھرا لیکن مفرور غلام کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر کتوں کو خلیج کے دلدلی حصوں تک لے جایا گیا لیکن تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ وِلے کچھ اس احتیاط اور رازداری سے بچ نکلا تھا کہ اس کا نشان تک نہ ملا۔ اس طرح جب دن ہفتوں میں بدلنے لگے تو ہم لوگوں میں سے کچھ نے خیال کیا کہ چونکہ وِلے تیرنے میں کمزور تھا وہ ضرور خلیج میں ڈوب گیا۔ جبکہ کچھ دوسرے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ وہ مگرمچھ کا لقمۂ تر بن گیا ہوگا۔ البتہ ہم سب خصوصاً چچا ابرام اس کی سلامتی کی دعائیں کرتے رہتے۔ تیسرے ہفتے کے اختتام پر جب تمام امیدیں ختم ہو چکی تھیں، ایک دن وِلے ہمارے درمیان نمودار ہو گیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اپنے کھیتوں سے باہر نکل کر اس کا ارادہ تھا کہ جنوبی کیرولینا جا کر اپنے پرانے مالک بفورڈ کے دامن میں پناہ حاصل کر لے۔ دن کے دوران تو وہ جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں میں چھپا رہتا البتہ رات ہونے پر وہ دلدلی علاقوں میں بہ ہزار دقت سفر کرتا۔ اس طرح ایک دن علی الصباح دریائے سرخ کے کنارے پہنچ گیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ دریا کس طرح پار کرے کہ ایک گورے کی نظر اس پر پڑ گئی۔ جس نے سب سے پہلے اس سے پاس مانگا۔ اور ظاہر ہے کہ پھر فوراً گرفتار کر کے الیگزینڈریہ کی جیل میں بند کرا دیا۔ جیل پہنچنے کے چوتھے پانچویں دن مسز ایپس کے چچا مسٹر جوزف اتفاقاً کسی سلسلے میں جیل خانے گئے تو وِلے کو پہچان لیا۔ انہوں نے جیل کی فیس ادا کی، ایک پاس بنوایا جس پر ایپس سے سفارش بھی تحریر کی کہ وہ وِلے کو معاف کر دے اور مزید تازیانے نہ مارے اور پھر وِلے کو ایپس کے پاس واپس بھجوا دیا۔

لیکن اپیس نے اس سفارش کا کوئی لحاظ نہ کیا اور تین دن تک معطل بلکہ محبوس رکھنے کے بعد اس پر ایسی شدید درّے بازی کی جس کے نتیجے میں پڑنے والے داغ ولے کے ساتھ قبر تک جائیں گے۔ یہ ولے کی فرار کی پہلی اور آخری کوشش تھی۔

میرا مشاہدہ تو یہی ہے کہ بھگوڑے اور مفرور غلاموں کو اکثر و بیشتر اپنی جان سے ہی ہاتھ دھونا پڑا۔ ایسا ہی ایک بدقسمت اور مفرور غلام آگسٹس تھا جو ہمارے ایک ہمسائے زمیندار مسٹر کیری کے فارموں پر ہانکا (ڈرائیور) کے فرائض پر مامور تھا۔ چھٹیوں کے دنوں میں یا کبھی کبھی ایک دوسرے سے متصل کھیتوں پر کام کرتے ہوئے میری اس سے ملاقات ہو جاتی جو رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گئی۔ گزشتہ موسمِ گرما میں بدقسمتی سے اُس کا اوورسیر کسی بات پر اُس سے بگڑ بیٹھا۔ وہ انتہائی بے درد اور ظالم انسان تھا۔ اس کی بے رحمی اور تشدد کے خوف سے آگسٹس فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ فرار کی پہلی منزل پر دن کی روشنی سے بچنے کی خاطر اس نے مسٹر ہاکنز کے فارم پر گنّوں کے بہت بلند ڈھیر کی چوٹی پر چھپ کر پناہ لے لی۔ ادھر کیری نے شکاری اور خونخوار کتوں کی فوج میں سے تقریباً پندرہ کو آگسٹس کا کھوج لگانے کے لئے ہر طرف دوڑا دیا۔ کئی گھنٹوں کی تلاش کے بعد کتے اپنی قوتِ شامہ کو استعمال کرتے ہوئے آگسٹس کی پناہ گاہ کے قریب پہنچ کر غرّانے اور زمین پر اپنے پنجے رگڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر اوورسیر ڈھیری کی چوٹی پر چڑھ گیا اور آگسٹس کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے زمین پر لا ڈالا۔ پھر کیا تھا کتوں کا پورا غول اس پر جھپٹ پڑا۔ اور اس کے پورے جسم کو اپنے لمبے لمبے دانتوں سے چھلنی کر ڈالا۔ تقریباً جسم کے سو مقامات پر کتوں کے دانت ہڈیوں تک در آئے۔ جب اُس میں زندگی کے آثار ختم ہونے لگے تو کتوں سے جدا کر کے اُسے ایک

خچر پر ڈال کر کیبن تک پہنچایا گیا لیکن بے چارے آگسٹس پر ظلم و جور کی یہ آخری قسط ثابت ہوئی کیونکہ اگلے ہی دن موت نے اسے تمام دکھ اور تکلیفوں سے ہمیشہ کے لئے نجات دلا دی۔

فرار کی کوشش میں ایسی صورتِ حال سے مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں کو بھی دوچار ہونا پڑتا تھا۔ چنانچہ کیری کے غلاموں کے ٹولے میں سیلسٹی نام کی ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکی بھی تھی اگرچہ وہ بھی افریقن نژاد تھی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آقا اور اس کی اولادوں کی طرح سفید فام تھی اور اس کو غلاموں کے زمرے میں سمجھنے میں اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا تھا میرا اس سے تعارف کا احوال کچھ یوں ہے کہ ایک رات میں اپنے کیبن میں بیٹھا وائکن پر دھیمے سروں میں ایک غم انگیز نغمہ چھیڑ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک وحشت زدہ پریشان حال، انتہائی دبلی اور کمزور گوری لڑکی سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا ''میں بہت بھوکی ہوں کیا مجھے کچھ کھانے کو مل جائے گا'' اس کا جواب تھا۔ پہلے تو میں نے خیال کیا کہ یہ مالکوں میں سے کسی کی خبط الحواس بیٹی ہے جو گھر سے نکل بھاگی ہے اور بھٹکتے ہوئے وائکن کی آواز پر اندر آ گئی ہے۔ لیکن اس کا معمولی غلاموں والا کاٹن کا لباس دیکھ کر میں شش و پنج میں پڑ گیا اور پھر کڑک کر پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے'' اس نے جواب دیا ''میرا نام سیلسٹی ہے اور میں مسٹر کیری کی ملکیت میں ہوں، میں نے دو دن سے پام کے جنگلوں میں پناہ لے رکھی ہے۔ میں سخت بیمار ہوں اور کام نہیں کر سکتی لیکن اوورسیر مجھے کوئی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور درّہ بدست میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اوورسیر کے ہاتھوں مارے جانے پر میں دلدلی زمینوں میں پھنس کر مر جانے کو ترجیح دیتی

ہوں۔ میں نے کیری کے کتوں کو پہلے اپنے حق میں سدھا لیا تھا اور وہ میرا سراغ لگانے میں اوورسیر کی بالکل مدد نہیں کرتے۔ میں بھوک سے مر رہی ہوں مجھے کچھ کھانے کو دو۔'' میں نے اپنے حصے میں سے ایک دو گوشت کے ٹکڑے اُسے دیئے۔ کھانے کے دوران اس نے اپنے فرار کا قصہ اور اپنی موجودہ جائے پناہ کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا وہ جگہ ماسٹر ایپس کے مکان سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر دلدلی ساحل پر پام کے انتہائی گھنے جنگلوں میں واقع تھی جہاں انسان کا گزر اور روشنی کی رمق کی رسائی نہ تھی۔

بہرحال کئی بار رات گئے وہ میرے کیبن میں کھانے کے لئے آتی رہی اور اپنی گوری رنگت کی وجہ سے سفید فام کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچتی رہی۔ ایک بار ماسٹر ایپس کو میرے کیبن میں کسی کے آنے جانے کی سن گن سی ملی اور وہ تفتیش پر آمادہ ہوا جس پر میں نے سیلسٹی کو کیبن میں آنے سے منع کر دیا اور اس کے بجائے میں خود مقررہ جگہ پر کھانا رکھ آتا تھا جس سے وہ اپنا پیٹ بھر لیتی اس طریقے سے گرمیوں کا موسم تو گزر گیا۔ اس دوران سیلسٹی کی صحت بھی ٹھیک ہو گئی اور وہ خاصی چاق و چوبند نظر آنے لگی لیکن سردیوں میں غیر معینہ عرصے تک اس طرح زندگی گزارنا ممکن نہ رہا تو اس نے خود کو مالک کے سامنے پیش کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

پہلے تو کیری نے بھاگنے کی سزا پر مقررہ تعداد میں بے دردی سے کوڑے لگائے اور پھر گردن میں ایک بھاری طوق ڈال کر کھیتوں کی طرف معمول کی مشقت کے لئے بھیج دیا۔

۱۸

ماسٹر ایپس نے وِلے کے ساتھ جس سنگدلی اور وحشیانہ پن کا مظاہرہ کیا تھا اُس کا تفصیلی ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے لیکن اس قسم کا غیر انسانی سلوک کسی خاص جرم یا کسی خاص فرد کے ساتھ ہی روا نہ تھا بلکہ ہمارا مالک تو "ڈنڈے کے بغیر بچہ بگڑ جاتا ہے" کے اصول پر کاربند تھا اور سزا دینے کے لئے جرم کا ہونا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اس پر اکثر و بیشتر تندخوئی اور بدمزاجی کے دورے سے پڑتے تھے جس کے دوران کسی معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر وہ مار پیٹ شروع کر دیتا۔ ایسا ہی ایک چھوٹا سا بہانہ اس کو میری کھال ادھیڑنے کا مل گیا۔ ہوا یوں کہ پائن وڈ کا رہائشی ایک شخص، مسٹر اونیل ایک دن ایپس کے پاس ملاقات کے لئے آیا اس کا پیشہ اور کاروبار بڑے پیمانے پر چمڑا سازی اور چمڑا رنگائی کا تھا۔ وہ ایپس سے مجھے خریدنا چاہتا تھا تا کہ اپنی ٹینری میں نفری بڑھا سکے۔ اتفاق سے

چچی فیبی نے جوڈنر کے اہتمام میں وہاں موجود تھیں یہ گفتگو سن لی۔ وہاں سے واپسی پر سب سے پہلے انہوں نے یہ بات مجھے بتائی۔ یوں بھی تمام عورتوں کی طرح چچی فیبی بھی کوئی بات سن کر اُسے بڑھا چڑھا کر بار بار بیان کرنے میں بہت مشہور تھیں۔ اگلے دن صبح کو ایک بار پھر سب ساتھیوں کے سامنے انہوں نے یہی بات ان الفاظ میں دہرائی ''بھئی سنا! ماسٹر ایپس پلیٹ کو پائن وڈ کے چمڑا ساز کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا ''چچی فیبی! میں تو اس سودے پر بہت خوش ہوں۔ میں چمڑا ساز بن جانا پسند کروں گا کیونکہ میں کپاس کے کام سے پہلے ہی سخت بیزار ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ مجھے خرید لے'' یہ کہتے ہوئے مجھے پتا نہ چل سکا کہ کچھ فاصلے پر کھڑی مسز ایپس ہماری باتیں سن رہی ہیں۔ قیمت پر اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے میرا سودا نہ ہو سکا اور مسٹر اونیل اگلی صبح کو واپس چلے گئے۔ جس کے بعد مسز ایپس نے میرے اور چچی فیبی کے درمیان ہونے والا مکالمہ ایپس کے گوش گزار کر دیا۔ یہ بات ہمارے مالک کو بھڑکا دینے کیلئے بہت کافی تھی وہ فوراً گھر سے نکل کر سیدھا میرے پاس آیا اور غضبناک لہجے میں بولا۔

''اچھا! تُو کپاس کے کام سے اتنا بیزار ہو چکا ہے کہ اپنا آقا تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ ہاں! تجھے گھومنے پھرنے اور صحت بنانے کا بہت شوق ہے، تُو چمڑا سازی کا کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ بہت اچھا کاروبار ہے۔ لیکن پہلے اس کاروبار کے رموز تجھے میں سکھاؤں گا۔ ذرا قمیص اُتار کر گھٹنوں کے بل لیٹ تو سہی۔''

یہ الفاظ سن کر میں کانپ گیا۔ میں نے بار بار معافی مانگی اور اسے رام کرنے کی بہتیری کوششیں کیں لیکن سب بے سود ہوئیں اور سوائے اس کا حکم ماننے

کے کوئی چارہ نہ پایا۔ تازیانے کی پہلی ضرب کے ساتھ ہی وہ بولا۔ ''چمڑا سازی کیسی لگی' اور پھر ہر وار پر وہ اسی طرح کے طنزیہ جملے ادا کرتا رہا'' چمڑے کی رنگائی کیسی ہے، چمڑا اس طرح کمایا جاتا ہے۔'' آخر میری کھال پر اچھی طرح چمڑا سازی کے بعد وہ کہنے لگا'' میں نے ابھی تجھے چمڑا سازی کا مختصر اور اوّلین سبق دیا ہے پھر جب کبھی اس کے بارے میں خیال آئے تو مجھے بتانا میں تیری کھال کو چمڑے میں بدل کر رکھ دوں گا۔''

انکل ابرام جیسے عمر رسیدہ اور نیک طبع انسان کے ساتھ بھی اکثر و بیشتر ایسے ہی جور و جفا کا سلوک ہوتا رہتا تھا۔ وہ ایک انتہائی وفادار، نرم گفتار اور مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ وہ اور میں ایک ہی کیبن میں رہے۔ اُن کے چہرے پر ہر شخص کیلئے خیر خواہی اور خوش خلقی بکھری رہتی لیکن ایپس کا دل تو سنگدلی اور شقاوت کا محور تھا۔

ایک سہ پہر کو مسز ایپس کا ایک پیغام مسٹر مارشل کے گھر پہنچا کر جب میں اپنے کیبن میں واپس آیا تو انکل ابرام کو خون میں تر بتر فرش پر پڑا ہوا پایا۔ اکھڑتی سانسوں کے درمیان انہوں نے بتایا کہ ایپس نے ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ تفصیلات سے پتا چلا کہ دوپہر کے وقت جب مچان پر کپاس پھیلائی جا رہی تھی ایپس ہومزِل سے حسبِ معمول نشے میں دُھت واپس پہنچا۔ نشے کی حالت میں اسے ہر کام میں نقص دکھائی دیا اور وہ تابڑ توڑ اُلٹے سیدھے حکم چلانے لگا جس پر عمل درآمد ممکن نہ تھا۔ انکل ابرام جو بڑھاپے کی وجہ سے تیزی سے کام کرنے کے قابل نہ رہ گئے تھے اور اس طرح کی صورتِ حال میں پریشان ہو جاتے تھے اُس کے احکام کی تعمیل نہ کر سکے۔ جس پر سخت غصے اور

بدمستی کے عالم میں ایپس نے جھپٹ کر اُن کی پیٹھ میں چھرا اُتار دیا۔ حسنِ اتفاق سے زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔ اس طرح جان تو بچ گئی لیکن خون بُری طرح بہہ گیا۔ مسز ایپس کو پتا چلا تو اس نے خود آ کر زخم کو ٹانکے لگائے اور شوہر کو بہت بُرا بھلا کہا لیکن اس موقع پر بھی مالکوں کی سوچ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مالکن نے ایپس کو جھاڑ پلاتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

''تم سے اس کے سوا کوئی امید نہیں کہ اپنے نشے اور غصے کے ہاتھوں تم فارم کے تمام غلاموں کو قتل کر دو گے جس کے نتیجے میں پورا خاندان غربت و افلاس کا شکار ہو جائے گا۔''

اسی طرح آنٹی فیبی بھی ایپس کی مار پیٹ کی عادت سے محفوظ نہ رہتی۔ اُس بڑی بی کو وہ آئے دن لکڑی کی چھڑی یا ہاتھ میں آئی ہوئی کسی چیز سے اذیت دیتا رہتا تھا۔ لیکن ایپس کے پاس میرے دس سالہ غلامی کے دوران انتہائی بے دردانہ اور ظالمانہ انداز میں تازیانوں کا ہدف ایک بار ایک بدنصیب لڑکی پٹیسی بنی تھی جس کا نہ صرف میں چشم دید گواہ ہوں بلکہ مجھے بھی اس کارِ بد کے انجام دینے پر زبردستی مجبور کیا گیا تھا۔

مسز ایپس کی پٹیسی سے جلن کا سبب اور احوال کا بیان ہو چکا ہے۔ ماسٹر ایپس کی غیر حاضری میں مالکن اکثر و بیشتر مجھے پٹیسی کو بے خطا و قصور دڑّے مارنے کا حکم دیا کرتی تھی۔ کئی بار تو میں یہ کہہ کر انکار کی جسارت کر بیٹھتا تھا کہ پٹیسی بے قصور ہے اس لئے مجھے ڈر ہے کہ مالک ناراض ہو کر الٹا مجھے سزا دے گا۔ ایک آدھ بار تو میں نے مالکن کو یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ جن حرکتوں کی وجہ سے اُسے پٹیسی پر غصہ آتا ہے اس کی ذمہ داری ایک کنیز کی حیثیت سے اس پر

نہیں آتی کیونکہ وہ مالک کی کسی جائز و ناجائز خواہش اور حکم سے سرتابی کی جرأت کر ہی نہیں سکتی اس لئے تمام تر ذمہ داری مالک ہی پر آتی ہے۔

زیادہ پرانی بات نہیں ہے کہ ایک اتوار کو حسب معمول ہم لوگ اپنے کپڑے دھونے کے لئے نہر پر گئے وہاں پٹیسی نظر نہ آئی۔ ایپس نے بلند آواز میں اسے پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ کسی نے اُسے اپنے فارموں سے باہر جاتے بھی نہ دیکھا تھا اس لئے سب حیران تھے کہ وہ کہاں چلی گئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ مسٹر شا کے کھیتوں کی طرف سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ شا اپنی بدکرداری اور آوارگی کی وجہ سے خاصا بدنام تھا مزید یہ کہ اس کے ایپس کے ساتھ کوئی بہتر تعلقات بھی نہ تھے۔ تاہم اس کی نیگرو بیوی جس کو پٹیسی پر ہونے والے مظالم کا علم تھا اکثر اس سے اظہارِ ہمدردی کیا کرتی اسی لئے کبھی کبھی پٹیسی اُس سے ملنے جایا کرتی تھی۔ اس آمد و رفت نے ایپس کے دماغ میں بے جا شبہات پیدا کر دیئے تھے اس کا خیال تھا کہ پٹیسی نے مسٹر شا سے ناجائز جنسی تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ مالک کو غیظ کے عالم میں دیکھ کر پٹیسی کانپ اُٹھی اور شروع میں تو اس کی پھٹکار کا جواب نہ دے سکی۔ اس کی خاموشی نے ایپس کے شکوک اور غصے میں مزید اضافہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر پٹیسی نے ہمت کر کے جواب دیا۔

"مجھے مالکن نے کپڑے دھونے کے لئے صابن نہ دیا تھا۔ مجھ سے اس قسم کی زیادتی کا سبب آپ کے علم میں ہے۔ میں مسز شا سے ایک ٹکڑا صابن لینے گئی تھی۔ دیکھئے یہ رہا، وہ ٹکڑا" اس نے جیب سے صابن کا ٹکڑا نکال کر دکھاتے ہوئے کہا" خدا گواہ ہے میرے مالک میں سچ کہہ رہی ہوں"۔ "تو جھوٹ بولتی ہے۔ کلوٹی حرافہ!" ایپس نے چیخ کر کہا" آقا میں جھوٹ نہیں بولتی اگر آپ مجھے

مار بھی ڈالیں تو میں اسی سچی بات پر قائم رہوں گی۔"

"اچھا تو میں تجھے شا کے ہاں جانے کا مزا چکھاتا ہوں اور تیرا قیمہ بناتا ہوں" دانتوں کو پیستے ہوئے یہ کہہ کر ایپس نے مجھے حکم دیا کہ چار کھونٹے لا کر زمین میں مقررہ جگہوں پر گاڑے جائیں۔ جب کھونٹے گڑ گئے تو اس نے پٹیسی کو حکم دیا کہ تمام لباس اُتار کر بالکل برہنہ ہو جائے اور پھر برہنہ لڑکی کو کھونٹوں کے درمیان منہ کے بل لٹا کر اس کے پیروں اور بازوؤں کو مضبوط رسوں سے کھونٹوں کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد گھر کے اندر سے چمڑے کا سب سے بھاری کوڑا لا کر میرے ہاتھ میں پکڑا دیا کہ میں اس بے جرم وخطا کو مارنا شروع کر دوں۔ کتنا ناگوار تھا میرے لئے اِس حکم کا ماننا مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ اپنے گھر کے برآمدے میں بچوں کیساتھ کھڑی مسز ایپس یہ منظر دیکھ کر خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ تمام غلام نہانا دھونا بھول کر قریب ہی اکھٹے ہو گئے تھے۔ اُن کے چہروں سے ان کے دلوں میں پوشیدہ رنج وافسوس صاف عیاں تھا۔

"زور سے!، اور زور سے مارو! ورنہ تمہاری اپنی باری آ جائے گی۔ بدمعاش غلام! اور تیزی دکھاؤ" ہر ضرب پر ایپس دیوانگی کے انداز میں چلّا کر کہتا اور ہر بار درد سے پٹیسی کی چیخیں نکل جاتیں وہ چیخ چیخ کر کہتی "رحم! میرے آقا رحم" خدا کے لئے رحم! میں بے قصور ہوں" لیکن اس کی فریاد بے اثر ثابت ہوتی رہی۔

تقریباً تیس دُرّے مارنے کے بعد میں رک گیا اور ایپس کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھا شاید اس کے حیوانی جذبے کی تسکین ہوگئی ہو۔ لیکن اس نے مجھے گالیاں اور دھمکیاں دیتے ہوئے دُرّے بازی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ مزید

پندرہ ضربوں کے بعد پٹیسی کی پیٹھ پر دُرّوں کے اُبھرے ہوئے نشانوں کا جال سا بچھا نظر آنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں دُرّہ پھینک کر الگ کھڑا ہو گیا۔ ایپس نے اس حکم عدولی پر مجھے سخت سزا کی دھمکی بھی دی لیکن اس غیر انسانی سلوک نے مجھ میں بغاوت کی روح بیدار کر دی تھی میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ایپس نے خود درّہ سنبھال لیا اور مجھ سے دس گنا زیادہ قوت کے ساتھ دُرّے لگانے شروع کر دیئے۔ اب فضا ایپس کی گالیوں اور پٹیسی کی چیخوں سے گونجنے لگی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ پٹیسی کی آہیں سسکیوں میں بدل گئیں اور بلا مبالغہ اس کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی نظر آنے لگی۔ کوڑا خون سے رنگین ہو چکا تھا لیکن ایپس نے اس وقت تک ہاتھ نہ روکا جب تک پٹیسی بالکل بے حس و حرکت نہ ہو گئی، اس کا جسم خاک و خون میں لتھڑ چکا تھا۔

ایپس نے آنٹی فیبی سے بالٹی میں پانی لا کر اس کا بدن دھونے کو کہا اور مجھے حکم ملا کہ اسے کیبن میں چھوڑ آؤں۔ جب میں نے رسیاں کھولیں اور اسے اُٹھانا چاہا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل نہ تھی۔ میں اُسے اپنے کاندھے پر لاش کی طرح اُٹھا کر کیبن میں لے آیا۔ راستے بھر مسلسل اُس کے کراہنے کی آواز نکلتی رہی۔ کیبن میں بھی وہ کئی گھنٹے تک اپنے تختے پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ رات ہونے پر آنٹی فیبی کہیں سے مرہم مانگ لائی اور اس کے زخموں پر لگایا اس کے باوجود وہ ساری رات سو نہ سکی اور غنودگی میں بھی اس کی سسکیاں اور آہیں سننے والوں کو بے چین کرتی رہیں۔ پیٹھ کے زخموں کی وجہ سے کئی دن تک وہ سیدھی لیٹنے کے قابل نہ ہو سکی اس سانحے کے بعد ہم نے دیکھا کہ

اس کی تیزی طراری اور خوش مزاجی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ دکھ اور غم کا احساس اس کی روح پر اس طرح حاوی ہو گیا تھا کہ ہم اس کی آواز سننے کو بھی ترس گئے تھے وہ شکستہ دلی کے ساتھ غم والم کی تصویر بنی سارا دن خاموش رہ کر مشقت میں لگی رہتی۔

اکثر حلقوں میں یہ غلط تاثر قائم ہے کہ غلاموں کو آزادی اور اس کی نعمتوں کا کوئی ادراک ہی نہیں ہوتا۔ جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ بایو بوف جیسے مقام پر بھی جہاں غلامی ایسی بدترین ظالمانہ شکل میں موجود تھی جس کا اندازہ امریکہ کی شمالی ریاستوں میں ہو ہی نہیں سکتا، ہم سب کو اپنے حقوق کا علم اور اپنی اُس محنت و مشقت کی قیمت کا بھی اندازہ تھا جس کے بل پر ہمارے گوری چمڑی والے مالکوں کی عیاشیاں قائم تھیں۔ اور ہم یہاں کے مروجہ ظالمانہ قانون کی ناانصافیوں سے بھی بے خبر نہ تھے جس نے آقاؤں اور غلاموں کی طرزِ زندگی کے درمیان زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیا تھا اور ان کو ہمارے جسم و جان پر ہر قسم کے تصرف کا حق دے دیا گیا تھا۔ غریب پٹیسی کو بھی علم تھا کہ اسی ملک میں ایک ایسا خطۂ ارض بھی ہے جہاں غلام و آقا کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ خصوصاً بربریت اور تشدد کے اس واقعے کے بعد اس نے شمالی ریاستوں کی آزاد فضاؤں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ وہ اکثر حسرت و یاس سے مجھ سے دریافت کرتی وہ کیسی جگہ ہو گی جہاں سیاہ فام غلام صرف اپنی ذات اور اپنے بیوی بچوں کے لئے محنت کرتے ہوں گے۔ جہاں ان کا اپنا گھر ہو گا جہاں وہ ظلم و جور اور ذہنی وجسمانی تشدد سے آزاد رہ کر زندگی گزارتے ہوں گے لیکن یہ باتیں اس کے لئے محض سہانے خواب تھیں جس کی تعبیر اسے کبھی حاصل نہ ہو سکی۔

مثل مشہور ہے کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے اور وہ اپنے باپ سے سبق حاصل کر کے اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ ایپس کے ظلم و جبر کا سبق اس کا دس بارہ برس کا بیٹا خوب سیکھ رہا تھا یا اسے سکھایا جا رہا تھا۔ کئی بار وہ عمر رسیدہ اور نیک طینت انکل ابرام کے اوپر اپنی کھیلنے والی چھڑی سے مشقِ ستم آزماتا اور کبھی اپنے ٹٹو کو بھگاتا ہوا کھیت کا رخ کرتا جہاں کھیل کھیل میں اوورسیر بن کر غلاموں کو درّے لگانا شروع کر دیتا۔ اس کا یہ کھیل اس کے والدین کیلئے انتہائی دل بستگی اور مسرت کا سامان ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اس غلط تربیت کا یہ اثر ہوگا کہ اس بچے کا دل رحم اور ہمدردی کے جذبات سے یکسر خالی ہو جائے گا اور جوان ہوتے ہوتے وہ ظلم و بربریت کا مجسمہ بن جائے گا۔

بظاہر چھوٹے ماسٹر میں کچھ خوبیاں بھی تھیں لیکن اس کو کوئی یہ تو نہیں سمجھائے گا کہ پیدا کرنے والے کی نگاہ میں رنگ و نسل کا کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ خالق کی نظر میں کالے پر گورے کو کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ جبکہ بچہ بہت چھوٹی عمر سے دیکھ رہا ہے کہ خچروں اور سیاہ فاموں سے کام لینے کے لئے دونوں کو ایک ہی کوڑے سے پیٹا جاتا ہے۔ اور گوری چمڑی والے سے تو بات کرنے سے پہلے سر سے ہیٹ اُتار لیا جاتا اور آنکھیں جھکا لی جاتی ہیں۔

۱۹

جون ۱۸۵۲ء میں ماسٹر ایپس نے اپنے لئے ایک نیا گھر بنوانا شروع کیا جس کا ٹھیکہ ایک معروف ٹھیکیدار مسٹر اوپری نے حاصل کیا تھا۔ پہلے کہیں ذکر آچکا ہے کہ ان علاقوں کے مکانوں میں تہ خانے نہیں بنائے جاتے کیونکہ زمین خاصی دلدلی ہے۔ دیواروں پر پلاسٹر کے بجائے صنوبر کے تختے لگا کر پسندیدہ رنگ کا پینٹ کیا جاتا ہے۔ ان تختوں پر بڑی محنت سے خوب رندہ پھیر کر سطح کو اچھی طرح ہموار اور چکنا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس زمیندار کا مکان بن رہا ہوتا اس کے غلاموں کو معمول کے علاوہ بہت سا فاضل کام کرنا پڑتا تھا لیکن ٹائی بڈ کی غلامی کے دوران مجھے بڑھئی کے کام کا خاصا تجربہ ہو گیا تھا اس لئے اوپری کی ٹیم کی آمد کے ساتھ ہی مجھے کھیتوں سے ہٹا کر مستقل طور پر لکڑی کے کام پر لگا دیا گیا۔ اُس کے کارندوں میں ایک شخص کا میں تاحیات احسان مند رہوں گا کہ اس کی وجہ سے

میری غلامی کے دن تمام ہوئے ۔وہ میرا محسن اور نجات دہندہ تھا۔ایک ایسا انسان جسے نیکی اور شرافت کا مجسمہ کہا جا سکتا ہے۔اس کا نام باس تھا اور وہ اسی دوران مارکس ول سے آیا تھا۔ پینتالیس پچاس برس کی عمر کا یہ بلند قامت سفید فام انسان انتہائی منطقی انداز میں مخاطب کو قائل کر دینے والی گفتگو کرتا تھا۔جبر و زیادتی کے اس تاریک ماحول میں سیاسیات ، اخلاقیات اور مذہب کے موضوعات پر میں نے اتنی شائستہ اور مدلل گفتگو نہیں سنی۔وہ حقیقی معنوں میں سدا کا کنوارا تھا اور اس کا کوئی دور یا قریب کا عزیز یا رشتہ دار بھی نہ تھا اسی لئے اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ بھی نہیں تھا بلکہ سیلانیوں کی طرح ایک ریاست سے دوسری ریاست گھومتا پھرتا رہتا۔البتہ گزشتہ چار سال سے بڑھئی کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے مارکس ول اور اردگرد کے علاقوں میں اچھی شہرت حاصل کر چکا تھا۔اس کے نظریات روشن خیالی کا مظہر تھے اور اپنی نیک طبعی اور خوش مزاجی کے سبب وہ سوسائٹی کا ایک ہر دلعزیز فرد تھا۔

ایک دن نئے مکان پر کام کے دوران باس اور ماسٹر ایپس کے درمیان غلامی کے موضوع پر بحث چھڑ گئی جسے میں قریب ہی کام کرتے ہوئے غور سے سننے لگا، باس کہہ رہا تھا۔"یہ بات ٹھیک نہیں ہے اور نہ انصاف پر مبنی ہے۔میں اگر کروڑ پتی ہو جاؤں تو بھی کسی کو غلام نہ بناؤں گا۔کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے۔تم کو بھی نہیں" ایپس بولا" کیوں نہیں، آخر میں نے رقم دے کر ان کو خریدا ہے" باس نے کہا ہاں ٹھیک ہے اور اگرچہ یہاں کے قانون نے تم کو اجازت دی ہے لیکن قانون بنانے والے بھی غلطی کر سکتے ہیں، غلامی انسانیت سے بعید ہے۔کیا تم اپنے لئے اسے گوارا کرلو گے۔"

"میری اور کالے حبشی کی کیا برابری؟" ایپس نے ٹوکا،

"یہ بات درست نہیں، میں نے بیشتر سیاہ فاموں کو اپنا جیسا کھرا انسان پایا ہے بلکہ بعضوں کو تو اپنے سے کسی قدر بہتر پاتا ہوں" باس نے رائے دی "اچھا، ایپس یہ تو بتاؤ کہ کیا اعلانِ آزادی کے تحت یہ نہیں کہا گیا کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ غلامی سخت ناانصافی اور ظلم ہے۔ جسے بہر حال ختم ہو جانا چاہیئے۔"

اس کے بعد اس طرح کا بحث ومباحثہ ان دونوں کے درمیان اکثر ہوتا لیکن ایپس نے اس گفتگو کو کبھی بحث برائے بحث اور الفاظ کے الٹ پھیر سے

زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔

باس اس پورے موسم گرما میں ایپس کے ساتھ رہا البتہ عموماً پندرہ دن میں ایک بار وہ مارکس ول چلا جاتا۔ جیسے جیسے میں اس کی باتیں سنتا اور اس کے طور طریقے دیکھتا رہا مجھے یقین ہوتا گیا کہ یہی وہ آدمی ہے جس پر اعتماد کر کے میں آزادی کے حصول میں مدد لے سکتا ہوں۔ اگرچہ سابقہ تجربوں نے مجھ میں یاس اور خوف پیدا کر دیا تھا اور یہاں کسی گورے سے بات کرنے تک کی غلاموں کو اجازت نہ تھی جب تک کہ وہ خود اس سے کلام نہ کرے تاہم میں اکثر و بیشتر مختلف کاموں کے دوران اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔

اگست کے اوائل میں ایک روز میں اور وہ کام پر تنہا تھے کیونکہ باقی ترکھان جا چکے تھے اور ایپس کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ یہ اس سے بات کرنے کا سنہری موقع تھا اور میں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا میں نے کہا "ماسٹر باس! آپ کا تعلق کس ملک سے ہے" "کیوں میاں! تمہارے

ذہن میں یہ سوال کیوں اُبھرا اور اگر میں بتا بھی دوں تو تم کیا سمجھ سکو گے۔ خیر! سنو میں کینیڈا میں پیدا ہوا تھا۔ اب تم کیا جانو کہ کینیڈا کہاں ہے“۔ ”کیوں نہیں میں تو وہاں ہو آیا ہوں۔ میں مانٹریال، کنگسٹن اور کوئنسٹن بھی جا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے بفلو، یارا چسٹر اور البنی بھی دیکھ رکھا ہے اور ایرک اور چمپلیں نامی نہروں کے کنارے آباد دیہاتوں کے نام تک بتا سکتا ہوں۔“

باس نے گردن گھما کر میری طرف غور سے دیکھا اور پوچھا ”پھر تم یہاں کیسے آ گئے۔“ جناب اگر انصاف کی عملداری ہوتی تو میں کبھی اس مقام پر اور اس حال کو نہ پہنچتا“ میں نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا ”اچھا یہ کیسے ہوا، تم کون ہو تم یقیناً کینیڈا رہ چکے ہو کیونکہ تم نے وہاں کے مقامات کے نام صحیح بتائے ہیں۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیسے لائے گئے۔“

”میرا یہاں کوئی دوست شناسا نہیں ہے میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر میں آپ کو یہ سب بتا دوں تو آپ ماسٹر ایپس کو بتا دیں گے۔ پھر آپ سمجھتے ہیں میرا کیا حشر ہوگا۔“

جب اس نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ میری ہر بات اور ہر لفظ کو صیغۂ راز میں رکھے گا تو میں نے کہا کہ یہ ایک لمبی دکھ بھری داستان ہے جس کے بیان کرنے میں کافی وقت صرف ہوگا اور مالک ابھی کسی لمحے آ دھمکے گا۔ بہتر ہوگا کہ رات کو جب سب سو جائیں تو میں سب کچھ بے کم و کاست بیان کر دوں۔ وہ فوراً آمادہ ہو گیا کہ رات کو اسی زیر تعمیر مکان میں ملے گا۔ چنانچہ آدھی رات گزرنے پر میں انتہائی خاموشی سے چھپتا چھپاتا وہاں پہنچ گیا اور اسے اپنا منتظر پایا۔ ایک بار پھر جب اس نے یقین دلا دیا کہ وہ دغا نہ دے گا تو پھر میں نے شروع سے آخر

تک تمام واقعات بیان کر دیئے اس کے دوران وہ مجھ سے مختلف سوالات بھی کرتا رہا۔ آخر میں، میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ میرے چند دوستوں کو خط لکھ کر اس صورتِ حال سے آگاہ کر دے تاکہ وہ میری رہائی اور آزادی کے لئے کاروائی کریں۔ باس نے حتی الامکان میری مدد کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی اس راستے کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے سخت رازداری برتنے کی تاکید کی پھر ہم دونوں نے آئندہ اقدام کا منصوبہ بنایا جس کے بعد میں اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔

اگلی رات کو ایک بار پھر ہم ایپس کے گھر سے کچھ دور نہر کے کنارے اُجاڑ سی جگہ پر اکٹھے ہوئے یہاں مسٹر باس کو میرے پرانے دوستوں اور عزیزوں کے نام اور پتے لکھنے تھے تاکہ مارکس وِل کے اگلے چکر کے دوران وہ انہیں خط لکھ کر میری کیفیت سے آگاہ کر سکے۔ دن کے وقت میں انٹی فیبی کی غیر موجودگی میں باورچی خانے سے چند ماچس کی تیلیاں اور موم بتی کے ٹکڑے اُٹھا لایا اور باس اپنے ٹول بکس کی پنسل اور کاغذ کے چند پُرزے نکال لایا تھا۔ اُس ویرانے میں جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ کر ہم نے موم بتی جلائی اور میں نے مارون، ولیم پیری اور پارکر کے نام اور پتے لکھوائے جو بالترتیب سراٹوگا شہر، سراٹوگا کاؤنٹی اور نیویارک کے رہائشی تھے۔ ہم اس مقام پر کوئی ایک گھنٹہ ٹھہرے جس کے دوران میں اس پر پورا پورا بھروسہ کر کے اپنے بیوی بچوں کے نام اور عمریں تک تفصیل سے بتا دیں۔ آخر میں شدتِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے اس کا ہاتھ تھام کر التجا کی کہ میرے کم عمر بچوں کے مستقبل کی خاطر مجھے اس ناحق غلامی سے نجات دلانے میں میری مدد کرے اس احسان پر

میں اپنی باقی زندگی اس کے لئے دعا گو رہوں گا۔ اپنی دوستی اور وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے اس نے کہا ''میں نے اس سے پہلے کسی کے ذاتی معاملہ میں اتنی دلچسپی نہیں لی کیونکہ میں ایک سیلانی اور آوارہ گرد انسان ہوں میرے آگے پیچھے کوئی بھی نہیں ہے۔ اب تو میں عمر کے آخری حصے میں پہنچ رہا ہوں اور کسی وقت بھی اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ اُس وقت کوئی مجھے یاد کرنے والا بھی نہ ہوگا۔ آج سے میں غلامی کے اِس شرمناک نظام کے خلاف عمومی جدوجہد کے لئے خود کو وقف کرتا ہوں تاکہ اس نیکی پر سرخرو ہو کر خالق کے سامنے جاؤں تاہم فی الوقت یہ کام انتہائی رازداری سے کرنا ہوگا۔

اس ملاقات کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے ملنا اور بات کرنا تقریباً ترک کر دیا اور اس نے ماسٹر ایپس سے بھی غلامی کے موضوع پر معمول کی بحث بند کر دی تھی تاکہ اس کو غلاموں کے ساتھ معمولی سی ہمدردی کا بھی شک نہ گزرے۔

مذکورہ ملاقات سے اگلے سنیچر کے روز باس معمول کے مطابق مارکس وِل چلا گیا جہاں اتوار کا دن اس نے اپنے کمرے میں خطوط لکھنے میں گزارا۔ ایک خط اس نے مشترکہ طور پر ولیم پیری اور پارکر کے نام لکھا اور خط کے آخر میں میرا اصلی نام یعنی سالومن نارتھپ لکھا اس نام سے یہاں مجھے کوئی نہ جانتا تھا البتہ پس نوشت میں صراحت کر دی کہ تحریر میری نہیں ہے شاید اس کا مقصد رازداری قائم رکھنا تھا۔

مارکس وِل سے واپسی پر باس نے مجھے اپنی کارگزاری سے آگاہ کر دیا۔ اسکے بعد ہم کبھی کبھی آدھی رات کے بعد ایک دوسرے سے ملاقات اور مشورے کر لیتے لیکن دن میں سوائے کام کے کوئی بات نہ کرتے۔ ہمارا اندازہ تھا کہ

جواب آنے میں زیادہ سے زیادہ چھ ہفتے لگ سکتے ہیں۔ چوتھے ہفتے کے آخر میں باس ایک بار پھر مارکس ول گیا مگر وہاں کوئی جوابی خط نہ تھا۔ اب میری مایوسی بڑھنے لگی لیکن ابھی امید ختم نہ ہوئی تھی، البتہ جب دس ہفتے گزر گئے تو میں نا امید ہو گیا۔ آخر کار مالک کا مکان بن کر مکمل ہو گیا اور پھر باس کی جدائی کا وقت بھی آ گیا وہ میرے لئے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے غلامی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب رہا ہوں جہاں سے دوبارہ کبھی نہ اُبھر سکوں گا۔

باس کا دردمند دل میرے ان تاثرات کو دیکھ کر دکھی ہو رہا تھا۔ اُس نے کرسمس سے ایک دن پہلے آنے کا وعدہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس وقت تک اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا تو میری نظر میں کئی دوسرے اقدامات ہیں۔ پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا اب تمہیں آزادی دلانا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن چکا ہے خواہ اس کے لئے خود مجھے سراٹوگا جانا پڑے۔

باس کے مستقل طور پر مارکس ول چلے جانے کے بعد مجھ سے وقت کاٹے نہ کٹتا۔ میں انتہائی بے صبری سے کرسمس کا انتظار کرتا رہا کیونکہ اب خطوط کے جواب کی توقع ختم ہو چکی تھی۔ کبھی میں سوچتا کہ خط گم ہو چکے ہیں اور کبھی خیال کرتا کہ نیویارک اور سراٹوگا میں وہ سب اپنے اپنے حال میں مست اور اپنی اپنی دلچسپیوں میں گم ہو کر مجھ قسمت کے مارے کالے حبشی کو فراموش کر چکے ہوں گے لہٰذا اب میری امیدوں کا مرکز صرف اور صرف باس تھا جس پر مجھے پورا بھروسہ تھا کہ ایک دن ضرور مجھے نجات دلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

۲۰

اپنے وعدے کے مطابق کرسمس سے صرف ایک دن پہلے شام کے وقت باس اپنے گھوڑے پر سوار ہمارے یارڈ میں آ دھمکا۔

’’کیسے مزاج ہیں جناب؟ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر‘‘ ماسٹر ایپس نے باس کا استقبال کرتے ہوئے کہا

’’خلیج کے علاقے میں کچھ کام تھا۔ میں نے سوچا واپسی پر آپ سے ملاقات کے لئے یہاں ایک رات قیام کروں۔‘‘ باس نے بے تکلفی سے کہا۔ میں احتیاطاً اُن کے سامنے نہیں گیا۔ دن بھر کی مشقت کے بعد رات کو دس بجے اپنے کیبن میں داخل ہوا تو انکل ابرام اور بوب پہلے ہی آ کر لیٹ چکے تھے میں بھی اپنے تختے پر لیٹ کر بالکل سوتا بن گیا۔ آدھی رات کے بعد جب سب خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے میں خاموشی سے باہر نکل کر ایپس کی رہائش گاہ

کے باہر کھڑا ہو گیا کہ شاید باس مجھ سے ملنے آئے لیکن کافی دیر تک جب کوئی آہٹ نہ سنائی دی تو میں سمجھ گیا کہ اہلِ خانہ کے شک کے پیشِ نظر اس نے باہر نکلنا مناسب نہ سمجھا ہو گا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ علی الصباح ماسٹر ایپس کے بیدار ہونے سے پہلے ضرور مجھ سے ملنے کی کوشش کرے گا چنانچہ کیبن میں واپس آ گیا مگر مجھے تمام رات نیند نہیں آئی، ابھی کافی اندھیرا تھا کہ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا انکل ابرام کی ڈیوٹی تو آج طلوعِ آفتاب کے وقت آگ روشن کرنے کی تھی اور بوب کے ذمہ خچروں کو صبح صبح چارہ ڈالنا پڑتا تھا۔ جب دونوں کیبن سے دور نکل گئے تو میں نے دیکھا کہ باس چلا آ رہا ہے۔ پاس آنے پر اُس نے بتایا ''اب تک تو کہیں سے جواب نہیں آیا'' یہ سن کر میرا دل رونے لگا اور میں نے کہا ''جناب! میری خاطر دوبارہ لکھیں میں اور بہت سے اپنے شناساؤں اور دوستوں کے نام بتاؤں گا۔ ظاہر ہے کہ سب تو وفات نہیں پا چکے ہوں گے اور ان میں سے کسی نہ کسی کو تو مجھ پر رحم آ ہی جائے گا'' باس فیصلہ کن انداز میں بولا ''کوئی فائدہ نہیں، میرا خیال ہے کہ بار بار لکھنے میں مارکس ول کے پوسٹ ماسٹر کو شک پیدا ہونے لگے گا۔ اب یہ طریقہ غیر یقینی اور خطرناک ہو سکتا ہے'' اس کی بات سے مجھے دھکا سا لگا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور مجھے باقی زندگی یہیں کاٹنی ہو گی۔'' میں نے دل شکستہ ہو کر کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے کئی اور طریقے ہیں۔ سرِ دست میرے پاس ایک دو ایسے کام ہیں جو مارچ یا زیادہ سے زیادہ اپریل تک مکمل ہو جائیں گے تب تک میرے پاس ایک معقول رقم زادِ سفر کیلئے جمع ہو جائے گی اور میں بذاتِ خود سراٹو گا

جاؤں گا۔"

بات جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں اس علاقے میں بہت رہ لیا اور کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ ایک بار شمالی علاقوں کی طرف نکلوں مجھ سے اب غلامی کے یہ مناظر نہیں دیکھے جاتے۔ اگر تمہیں یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے اپنی زندگی کا حاصل سمجھوں گا اور پلیٹ! اب میں نے یہ کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ بات کو مختصر کرتا ہوں، کیونکہ اگر ایپس بیدار ہو گیا تو تمہارے اور میرے دونوں کے لئے مشکل ہو جائے گی۔ تم سراٹوگا، سینڈی ہل اور اس کے مضافاتی علاقوں میں جتنے آدمیوں کو جانتے ہو یا جن سے ایک بار بھی ملے ہو سب کے نام سوچ کر رکھو۔ میں سردیاں ختم ہونے سے پہلے کسی بہانے سے ایک بار پھر یہاں آؤں گا اس وقت میں تمام نام لکھ لوں گا اور پھر شمال میں جا کر جس طرح بھی ممکن ہو گا مسئلہ حل کروں گا۔ بس تم ہمت نہ ہارو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس دوران تم خوب اچھی طرح ماضی میں جا کر تمام نام ذہن میں لاؤ۔ خدا تم پر رحم کرے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کیبن سے نکل گیا اور تیزی سے ماسٹر ایپس کے مکان کا رُخ کر لیا۔

صبح کرسمس کا سورج طلوع ہوا۔ تمام سال میں یہی ایک دن غلاموں کے لئے سکون اور خوشی کا سامان لاتا تھا، کیونکہ آج انہیں کھیتوں پر مشقت کے لئے نہیں جانا۔ سب کے چہروں پر خوشی اور اطمینان کی جھلکیاں تھے۔ بڑی

دعوتوں میں مزیدار کھانوں اور رقص و موسیقی کا موقع آ پہنچا تھا۔ آج کے دن ان کے جسم صاف لباس اور سرخ ربن سے مزین نظر آتے اور ایک دوسرے سے کسی قدر مذاق اور چہلیں کر لیتے۔

ناشتہ کے بعد ماسٹر ایپس اور مسٹر باس باہر صحن میں آ کر چہل قدمی کرتے ہوئے کپاس کے بھاؤ اور اسی قسم کے دیگر موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ باس نے پوچھا ''آپ کے غلام اور کارندے کرسمس کہاں منائیں گے۔'' ایپس نے بتایا ''پلیٹ تو آج مسٹر ٹینر کی طرف جائے گا اس کے پیانو بجانے کی بڑی مانگ ہے، پیر کے دن تمام غلاموں کا مارشل کی طرف بلاوا ہے جبکہ منگل کے لئے نارووڈ کی لینڈ لیڈی مس میری میکوئی نے اپنے ہاں کی تقریب میں دعوت دی ہے''

''یہ جوان خاصا محنتی اور باصلاحیت دکھائی دیتا ہے۔ ذرا ادھر آنا، پلیٹ!'' یہ کہتے ہوئے باس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا گویا اس سے پہلے کبھی میری طرف خاص توجہ نہ کی ہو۔ ''ٹھیک کہا آپ نے۔''

ایپس بولا ''چاق و چوبند اور توانا ہونے کے ساتھ یہ سیدھا سادہ بندہ ہے مجھے تو اس کے سترہ سو ڈالر مل رہے تھے مگر میں نے سودا منظور نہیں کیا۔ اس کے کام میں غلطی کا امکان ہی نہیں رہتا۔''

اس گفتگو کے دوران غلاموں کے پرکھنے کے انداز میں باس نے مجھے گھما پھرا کر دیکھا اور ایپس کے انتخاب کی تعریف کی۔

تھوڑی دیر بعد باس گھوڑے پر سوار ہو کر مارکس ول کی طرف روانہ ہو گیا اور میں بھی پاس بنوا کر ٹینرز کی طرف جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔

کرتی رہیں۔

ڈنر کے بعد میزوں کو ہال سے ہٹا دیا گیا تا کہ رقص کرنے والوں کے لئے جگہ بن سکے اور میں نے اپنے وائلن پر ایک تیز اور پُر مسرت دُھن چھیڑ دی۔ پھر کیا تھا رقاصوں نے اپنے فن کا پُر جوش مظاہرہ کیا جبکہ کچھ دوسرے لوگوں نے گانا شروع کیا۔ غرض پورا ہال رقص و سرود کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ پروگرام کے اختتام پر مس صاحبہ سب کو رخصت کرنے کیلئے ہال کے دروازے پر آ گئیں۔ آج اُن کا حُسن قیامت ڈھا رہا تھا سیاہ زلفیں ان کے آتشیں عارض پر اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ موزوں قد و قامت میں ایک خاص کشش کے ساتھ رفتار میں وقار و تمکنت نمایاں تھا۔ وہ فرداً فرداً سب کو کرسمس کی مبارکباد کے ساتھ اپنی دلنشیں مسکراہٹ سے نوازتی رہیں اور جواب میں ہر ایک کے لبوں پر اُن کے لئے تشکر اور دعائیہ کلمات آ رہے تھے۔

میں نے مس مکوئی کی دعوت اور ان کے اخلاق کا کسی قدر تفصیلی ذکر اس لئے کیا ہے کہ آپ بیتی پڑھنے والے یہ سمجھ سکیں کہ بایو بوف کے تمام زمیندار اور غلاموں کے آقا ٹائی بڈ، برچ یا ایپس ہی کی خصلت کے نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک آدھ ولیم فورڈ یا مس میری مکوئی جیسی ہمدرد اور با اخلاق ہستیاں بھی موجود ہیں۔ لیکن بات تو اُس ظالمانہ نظام اور قانون کی ہے جس کے تحت انہیں اپنے سیاہ فام غلاموں پر ہر قسم کے غیر انسانی سلوک روا رکھنے کی اجازت اور ان کی زندگی و موت پر مکمل اختیار حاصل ہے۔

ماسٹر ایپس کی عطا کردہ تین دن کی تعطیلات منگل کو ختم ہو گئیں چنانچہ بدھ کی صبح جب میں واپسی کے سفر میں تیزی سے ولیم پیئرز کے کھیتوں کے قریب

سے گزر رہا تھا۔اس نے مجھے روک کر بتایا کہ اس نے ماسٹر ایپس سے ایک چٹ پر اجازت حاصل کی ہے کہ میں اس کے ہاں آج کرسمس تقریب میں وائلن نوازی کروں۔ سیاہ فاموں کے ناچ کا اس علاقے میں یہ سب سے بڑا جشن سمجھا جاتا تھا۔عجب اتفاق ہے کہ بایو بوف میں میرے دورِ غلامی کی یہ آخری اور سب سے بڑی محفل ثابت ہوئی جو اگلے دن سورج نکلنے تک جاری رہی۔ واپسی پر میرا تھکن سے بُرا حال ہو چکا تھا لیکن جیب میں بھرے ہوئے ان سکوں کی کھنک مجھے توانائی بخش رہی تھی جو میرے فن کے مظاہرے پر حاضرین کی طرف سے ملے تھے۔

اب میں ماسٹر ایپس کے ہاتھوں خود پر تازیانہ زنی کی آخری واردات کا حال بیان کرتا ہوں۔ کرسمس کی تقریبات سے اگلے سنیچر کو ایسا اتفاق ہوا کہ شاید پہلی مرتبہ صبح کے وقت پر میری آنکھ نہ کھلی۔ کیبن سے باہر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو سارے غلام کھیتوں کی طرف جا چکے تھے۔اب تو میں گھبرا گیا اور بغیر کچھ کھائے پیئے ہی کھیتوں کی طرف تیزی سے دوڑ پڑا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ ایپس گھر کے برآمدے میں چہل قدمی کر رہا ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چیخ کر بولا ''یہ تمہارے بیدار ہونے کا وقت ہے؟'' میں تیزی سے بھاگتا ہوا کھیت میں پہنچ کر اپنے کام پر لگا ہی تھا کہ وہ ہاتھ میں کوڑا لئے ہوئے آموجود ہوا۔ میں نے لجاجت سے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ وقت پر میری آنکھ نہ کھل سکی اور تھوڑی سے دیر ہو گئی لیکن اُس کی لغت میں تو ہمارے لئے معافی کا لفظ ہی نہ تھا فوراً قمیص اُتار کر لیٹنے کا حکم ملا اور پوری قوت سے پندرہ بیس ضربیں لگا کر اس نے اپنی غیر انسانی خصلت پوری کر لی۔

پیر تین جنوری ۱۸۵۳ء کو منہ اندھیرے جب ہم اپنے کیبن سے نکل کر کھیت میں پہنچے تو انتہائی سردی تھی۔ جنوری یوں بھی اس علاقہ کا سرد ترین مہینہ ہوتا ہے ہم پانچوں ساتھی یعنی میں، انکل ابرام، بوب، پٹیسی اور وِلے کپاس کے تھیلے گلے میں لٹکائے ایک قطار میں کھڑے چنائی کا کام شروع کر رہے تھے کہ کسی طرف سے ایپس نمودار ہوا۔ خلافِ معمول اس وقت اس کے ہاتھ میں درّہ نہیں تھا ۔ انتہائی غلیظ زبان استعمال کرتے ہوئے اس نے غصے سے چیخ کر کہا ''تم لوگ وقت ضائع کر رہے ہو۔ ابھی تک کام شروع نہیں کیا؟'' وِلے نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''جناب! سخت سردی سے ہماری انگلیاں اتنی سن ہو گئی ہیں کہ کوشش کے باوجود تیزی سے کام ممکن نہیں رہا۔''

یہ سن کر ایپس خود کو ملامت کرنے لگا کہ وہ کیوں کوڑا لانا بھول گیا پھر بولا ''اچھا میں ابھی واپس آ کر تم لوگوں کی سردی دور کیئے دیتا ہوں'' اور غصے میں پھنکارتا ہوا گھر کی طرف چلا گیا۔ اور ہم آپس میں بات کرنے لگے کہ اِن ٹھٹھری ہوئی انگلیوں سے کام کرنا جتنا مشکل ہے اتنا ہی ہمارا مالک ہم سے خلافِ عقل و انسانیت روّیہ رکھتا ہے۔ اسی دوران کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھوڑا گاڑی تیزی سے فارم میں داخل ہوئی اور گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر اس سے دو آدمی اُتر کر ہماری طرف آ گئے۔

یہی وہ لمحہ تھا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔ اگلے ایک گھنٹے کے اندر اپنی گردن سے کپاس کا تھیلا اُتارتے ہوئے میں نے ماسٹر ایپس کو الوداع کہا۔ بہر نوع میں اگلے باب میں ان کارروائیوں اور مرحلوں کا ذکر کروں گا جن کی

تفصیل مجھے سراٹو گا پہنچ کر معلوم ہوئی اور جس کے نتیجے میں خدا کے فضل اور مسٹر باس کی خدا ترسی کے طفیل مجھے آزادی کی منزلِ مُراد حاصل ہوئی۔

۲۱

مسٹر باس نے پارکر اور پیری کے نام جو خط مارکس ول کے ڈاکخانے سے پندرہ اگست ۱۸۵۲ء کو پوسٹ کیا تھا وہ ستمبر کے وسط میں سراٹوگا پہنچ گیا لیکن اس سے کچھ عرصے پہلے میری بیوی این نے گلن فالز میں واقع کارپنٹرز ہوٹل میں کیٹرنگ کا کام سنبھال لیا تھا تاہم اس نے سراٹوگا کا گھر نہیں چھوڑا تھا کیونکہ بچے وہیں رہتے تھے اور وہ اختتام ہفتہ آ کر ان کی خبر گیری رکھا کرتی تھی۔ پارکر اور پیری نے خط ملتے ہی این کو بھجوا دیا۔ بچے خط پڑھتے ہی بیقرار ہو کر فوراً سینڈی ہل کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ مسٹر ہنری نارتھپ سے اس معاملہ میں امداد اور مشورہ حاصل کریں۔

مسٹر ہنری نارتھپ سے ہمارے خاندانی تعلقات ہیں اس کے علاوہ وہ

ایک بہت معروف وکیل بھی ہیں۔انہوں نے خط کو اچھی طرح پڑھنے کے بعد سمجھ لیا کہ میرے کیس کا تعلق ریاست نیویارک کے ۱۴رمئی ۱۸۴۰ء کو پاس ہونے والے ایکٹ سے ہے جس کے تحت ریاست کے گورنر پر لازم ہے کہ اگر اُسے مصدقہ طور پر اطلاع ہو جائے کہ ریاست کے کسی آزاد شہری کو اغوا کر کے یا دھوکہ دے کر اور امریکہ کی کسی دوسری ریاست لے جا کر غلام بنالیا گیا ہے تو وہ اسے آزاد کرانے کے لئے تمام ممکنہ اقدامات کرے۔وہ اس سلسلے میں کسی معتبر شخص کو اپنا ایجنٹ مقرر کر سکتا ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری دستاویزات اور شواہد جمع کرے گا اور متعلقہ ریاستوں میں جا کر تمام قانونی کارروائی مکمل کر کے متاثرہ شہری کو آزاد کرانے کا ذمہ دار ہو گا جبکہ اس پر اُٹھنے والے اخراجات ریاستی خزانے سے ادا کئے جائیں گے۔

اس سلسلے میں گورنر کو مطمئن کرنے اور اس کو احکامات جاری کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے دو باتوں کا ثبوت مہیا کرنا ضروری تھا۔اولاً یہ کہ میں واقعی نیویارک کا آزاد شہری ہوں۔دوسرے یہ کہ مجھے زبردستی اور غیر قانونی طور پر غلام بنا کر رکھا گیا ہے۔پہلی بات کا ثبوت دینا تو مشکل نہ تھا کیونکہ علاقے اور گردونواح کے تمام بزرگ اور اہم لوگ گواہی دینے کے لئے تیار تھے البتہ دوسری بات کا ثبوت محض پارکر اور پیری کے نام خط تھا جو ایک نامعلوم شخص کی تحریر میں تھا۔

بہر نوع کافی غور وخوص کے بعد مسٹر ہنری نارتھپ کے مشورے سے ریاست نیویارک کے گورنر مسٹر ہنٹ کے نام این کی طرف سے ایک درخواست تیار کی گئی۔جس میں میرے نیویارک کے آزاد شہری کی حیثیت کا تذکرہ، ہماری شادی کی تاریخ وغیرہ میرا نیو آرلینز سے خط اور پھر باس کے ہاتھ سے لکھے ہوا

دوسرے خط کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ ایکٹ کے تحت ایجنٹ مقرر کرنے اور مجھے غلامی سے نجات دلانے کی التجا کی گئی تھی۔ درخواست کے ساتھ تمام ضروری دستاویزات اور حلف نامے منسلک کیے گئے۔

درخواست پر حکم جاری کرتے ہوئے گورنر نے ۲۳ر نومبر ۱۸۵۲ء کو مسٹر ہنری نارتھپ کو پورے اختیارات دے کر ایجنٹ مقرر کر دیا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ تمام ضروری اقدامات کریں اور اس سلسلے میں لوزیانہ جا کر میری آزادی بحال کرنے کی کارروائی مکمل کریں۔ بعض ناگزیر مصروفیات کی بنا پر ہنری نارتھپ کی روانگی میں کسی قدر دیر ہوئی۔ بہرنوع ۱۴ر دسمبر ۱۸۵۲ء کو وہ سینڈی ہل سے دارلحکومت واشنگٹن روانہ ہوئے۔ جہاں انہوں نے لوزیانہ کے سینیٹر اور سپریم کورٹ کے جج سے ملاقات کی اور ان سے تمام دستایزات کی تصدیق کراتے ہوئے لوزیانہ کے متعلقہ حکام کے نام تحریری ہدایات حاصل کیں جس کے تحت اس کام کی تکمیل میں ہر قسم کے تعاون کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کارروائی کے بعد ہنری نارتھپ واشنگٹن سے بالٹی مور ہوتے ہوئے پٹس برگ پہنچ گئے اور یہاں سے ایک اسٹیمر کے ذریعے دریائے سرخ میں مارکس ول کی طرف سفر شروع کیا۔ دریائے سرخ ایک سست رفتار اور پیچ وخم والی آبی گزرگاہ ہے جس کے دونوں طرف صدیوں پرانے جنگلات اور بڑے بڑے دلدلی علاقے ہیں اور تقریباً تمام راستہ ویران اور غیر آباد ہے۔ اس طویل دریائی سفر کو طے کر کے ہنری نارتھپ یکم جنوری ۱۸۵۳ء کو صبح نو بجے مارکس ول کے ساحل پر جا اُترے اور بغیر وقت ضائع کئے اُسی دن کاؤنٹی کورٹ جا کر وہاں کے ممتاز اور ذہین وکیل مسٹر ویڈل سے ملاقات کی۔

چونکہ پارکر اور پیری کے نام خط مارکس ول سے پوسٹ کیا گیا تھا اس لئے یہ تو واضح تھا کہ یہیں یا آس پاس کے کسی علاقے میں، میں موجود ہوں۔ بہرحال مسٹر ویڈل ایڈووکیٹ نے پہلے تو تمام خطوط اور دستاویزات کا بغور جائزہ لیا اور پھر اس سلسلے میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ دراصل وہ اس علاقے کی اُن چند شخصیات میں سے ہیں جو دل کی گہرائیوں سے اغوا اور جبر کے خلاف اور قانون کی حکمرانی کے علمبردار ہیں لیکن بہرحال انہوں نے سالومن نارتھپ کا نام بھی کبھی نہ سنا تھا۔ یوں بھی میں پلیٹ کے نام کا ایک غیر معروف غلام ہی تو تھا۔ پارکر اور پیری کے نام خط پر تاریخ کے ساتھ مقام کے طور پر بایو بوف درج تھا اس سے یہ تو طے کر لیا گیا کہ مجھے اسی بایو بوف کے علاقے میں تلاش کیا جائے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ علاقہ دریائے سرخ کے دونوں جانب پچاس سے سو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اور چونکہ زمین بہت زرخیز تھی اس لئے بیشتر چھوٹے بڑے زمیندار ہزاروں سیاہ فام غلاموں کے ساتھ یہاں آباد تھے۔ خط اتنا غیر واضح اور مبہم تھا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تلاش کا کام کہاں سے اور کیسے شروع کیا جائے۔ اسی سوچ بچار کے دوران مسٹر ہنری نارتھپ اور مسٹر ویڈل کی گفتگو کا رخ نیویارک کی سیاست اور سیاسی پارٹیوں کی طرف مڑ گیا۔ ہنری نارتھپ نے بتایا "ہماری ریاست میں ایک نئی سیاسی پارٹی اُبھر رہی ہے جو غلامی کو مکمل طور پر ختم کرنے اور کاشتکاروں کو زمین کا مالک بنا دینے کی تحریک چلا رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے اس حصے میں تو اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے" مسٹر ویڈل بولے "نہیں، بالکل نہیں۔ البتہ باس نامی ایک شخص اِن خیالات کا حامی ہے بہت با اخلاق اور دلچسپ شخصیت کا حامل ہونے کے ساتھ ایک ماہر مکینک اور کارپینٹر ہے" یہ کہتے

کہتے مسٹر ویڈل کو اچانک کچھ خیال آیا اور انہوں نے ایک بار پھر پیری اور پار کر کے نام خط پر اپنی نظریں جمالیں اور بڑ بڑائے۔

''بایو بوف پندرہ اگست، خط یہاں پر (مارکس وِل) کی مہر'' پھر اپنے بھائی کی طرف مڑ کر پوچھا'' کچھ یاد ہے باس پچھلی گرمیوں کے دوران کہاں کام کر رہا تھا''

''بایو بوف کے علاقے میں کسی جگہ'' جواب ملا۔''بس وہی سالومن نارتھپ کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے'' مسٹر ویڈل ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔ اب باس کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ دو ہفتوں کے لئے مارکس وِل سے روانہ ہو رہا تھا کہ مسٹر ویڈل کا پیغام ملنے پر فوراً آ گیا۔ مسٹری ہنری نارتھپ سے تعارف کے بعد تفصیلی باتیں ہوئیں اور بالآخر تمام گتھی سلجھ گئی اور سراغ مل گیا۔ مسٹر باس نے معاملہ میں خصوصی دلچسپی ظاہر کی وہ بہت خوش تھا کہ اس کا ہدف پورا ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ بصورتِ دیگر وہ بذاتِ خود آئندہ موسمِ بہار میں سراٹوگا جانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ چلتے وقت اس نے ایک کاغذ پر بایو بوف اور ماسٹر ایپس کے گھر تک کا نقشہ بنا کر ہنری نارتھپ کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد نوجوان ایڈوکیٹ مسٹر ویڈل اور جہاں دیدہ ماہر قانون مسٹر ہنری نارتھپ نے میری آزادی کے حق کے لئے قانونی کارروائی کی تیاری شروع کی جس میں مجھے مدعی اور ہنری نارتھپ کو میرا وکیل جبکہ ماسٹر ایپس کو مدعا علیہ بنایا گیا۔ اس سلسلے میں علاقے کے شیرف کو عدالت کے حکم پر مجھے اپنے قبضہ میں اس وقت تک رکھنا تھا جب تک حتمی فیصلہ نہ ہو جائے۔ اب آدھی رات ہو چکی تھی۔ جج سے شیرف کے نام حکمنامہ حاصل کرنا اور پھر اُسے (شیرف) کو ساتھ

لے کر مجھ تک پہنچنے میں وقت درکار تھا جبکہ اگلا دن اتوار کا تھا لہٰذا تمام کارروائی پیر تک کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ اتوار کو سہ پہر کے وقت مسٹر ویڈل نے ہنری نارتھپ کے سامنے ایک نئی دشواری کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ باس نے جاتے جاتے اپنے ایک بااعتماد ساتھی سے مسئلے کا ذکر کر دیا اور اس طرح شدہ شدہ یہ افواہ پھیلنی شروع ہو گئی ہے کہ ایک اجنبی شخص ماسٹر ایپس کے کسی پرانے غلام کی تلاش میں آیا ہوا ہے۔ مارکس ول میں ایپس کے کئی جاننے والے ہیں۔ لہٰذا یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر کسی طرح اُسے خبر ہو گئی تو وہ مجھے راتوں رات کہیں غائب کر دے گا۔ چنانچہ فوری کارروائی کرتے ہوئے ایک طرف ویڈل نے شیرف کے گھر جا کر اُسے بھی آدھی رات کو چلنے کے لئے تیار رہنے کی درخوست کی اور دوسری طرف ہنری نارتھپ نے جج کی خدمت میں حاضر ہو کر پیر کی علی الصباح حکمنامہ جاری کرنے کی التجا کی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ دونوں حضرات نے قانون پر عملدرآمد میں پوری مدد کی۔

غرض اُسی دن آدھی رات کے بعد جب کاغذات مکمل ہو گئے اور جج نے دستخط بھی کر دیئے تو ایک گھوڑا گاڑی میں مسٹر نارتھپ، اور شیرف بیٹھ کر بایوبوف کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سوچ کر کہ ایپس میری آزادی کے سوال پر مسٹر نارتھپ سے غیر ضروری حُجت کرے گا انہوں (مسٹر نارتھپ) نے خود یہ مشورہ دیا کہ پہلے شیرف صاحب کو مجھ سے سوال جواب کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ کیس کی اگلی کارروائی میں زیادہ مدد مل سکے۔

یہی وہ وقت تھا جس کا ذکر میں نے پچھلے باب کے اختتام پر کیا تھا۔ جوں ہی ایپس اس دھمکی کے ساتھ گھر کی طرف گیا کہ ابھی کوڑا لا کر وہ ہم لوگوں کی

سردی دور کرتا ہے۔ ہم نے گھوڑا گاڑی یارڈ میں داخل ہوتے دیکھی۔ ہم پر نظر پڑتے ہی گاڑی رُک گئی، اور اس میں سے دو افراد کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ مسٹر شیرف اور ہنری نارتھپ تھے۔ اس انداز میں گوری رنگت کے اجنبیوں کا اتنی صبح ہماری طرف کھیتوں میں آنا بہت غیر معمولی اور تعجب خیز بات تھی۔ انکل ابرام اور پٹیسی حیران ہو کر کچھ بولے بھی تھے کہ اسی اثناء میں بوب کی طرف بڑھتے ہوئے شیرف نے پوچھا ''تم میں پلیٹ کون ہے؟'' بوب نے سر سے ہیٹ اُتارتے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے کہا...... ''جناب یہ ہے'' میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا یہ کون ہے اور مجھ سے اس کو کیا کام پڑ سکتا ہے ''تمہارا نام ہی پلیٹ ہے نا'' اس نے خود مجھ سے تصدیق چاہی۔ ''ہاں جناب'' میں نے جواب دیا۔ اب شیرف نے چند گز کے فاصلے پر کھڑے مسٹر نارتھپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''تم ان صاحب کو جانتے ہو'' اب جو میں نے نظریں جما کر اُدھر دیکھا تو تصورات کی ایک دنیا میرے دماغ میں گھومنے لگی۔ مسٹر نارتھپ کے چہرے کے ساتھ ہی میرے ذہن کے پردے پر بچوں کی، این کی اور تمام دوستوں کی یہاں تک کہ مرحوم باپ کی تصویریں گھومنے لگیں۔ چند لمحے کے لئے میرا جسم لرزا اور پھر ہاتھ بلند کرتے ہوئے میں چیخ پڑا ''ہنری نارتھپ۔ خداوندا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے'' چند لمحات میں مجھے ساری بات سمجھ میں آ گئی کہ میری غلامی سے نجات کا وقت قریب آ چکا ہے۔ مجھے مسٹر نارتھپ کی طرف بڑھتے دیکھ کر شیرف نے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر سوالات شروع کیے۔

''تمہارا پلیٹ کے علاوہ بھی کوئی نام ہے؟''

”جناب میرا اصلی نام سالومن نارتھپ ہے۔“

”تمہارے بال بچے بھی ہیں؟“

”میری ایک بیوی اور تین بچے ہیں۔“

”تمہاری بیوی کا شادی سے پہلے کیا نام تھا؟“

”این ہمپٹن۔“

”تمہارے بچوں کے نام؟“

”مارگریٹ، ایلزبتھ اور الانزو۔“

”تمہاری شادی کی رسم کس نے ادا کی؟“

”فورٹ ایڈورڈ کے مسٹر ٹمودی ایڈی نے۔“

”وہ اب کہاں رہتے ہیں؟“

”سینڈی ہل، واشنگٹن کاؤنٹی، نیویارک سٹیٹ۔“

وہ ابھی اور سوالات کرنے والے تھے کہ میں خود پر مزید قابو نہ پا سکا اور آگے بڑھ کر اپنے ہمدرد اور شناسا کو دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ اب الفاظ کے بجائے صرف آنسو میرے جذبات کی ترجمانی کرنے لگے۔ میرے ساتھی حیرت سے منھ کھولے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ گزشتہ دس سال سے میں اِن لوگوں کے ساتھ کھیتوں میں، کیبن میں، دکھ اور تکلیفوں میں، چھوٹی موٹی خوشیوں میں شریک رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے غمگسار اور درد آشنا تھے۔ لیکن کسی کو آج تک میرے اصلی نام کا علم نہ تھا۔ مسٹر نارتھپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بورا گردن سے نکال کر پھینک دو۔ اب تمہارے کپاس چننے کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ آؤ اُس آدمی کی طرف چلیں جس نے تمہیں دس سال تک

غلام بنائے رکھا۔"

ہم تینوں ماسٹر ایپس کے مکان کی طرف بڑھنے لگے تو میں نے رندھی آواز میں سب سے پہلے مسٹر نارتھپ سے اپنے گھر والوں کی خیریت جاننا چاہی۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ دن پہلے وہ این اور بچوں سے ملے تھے۔ وہ سب بالکل ٹھیک ہیں۔ البتہ میری ماں انتقال کر چکی ہے جب ہم گھر کے قریب پہنچے تو ماسٹر ایپس پھاٹک پر موجود تھا اور ہم کو دیکھ کر سخت حیران اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ شیرف نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہنری نارتھپ کا تعارف کرایا۔ ایپس نے انہیں گھر کے اندر آنے کی دعوت دی اور مجھے آتش دان میں جلانے والی لکڑی لانے کا حکم دیا۔ میں نے تعمیل کرتے ہوئے جب لکڑیاں لا کر آگ پر ڈالنا شروع کیں تو دیکھا کہ پوری میز پر مختلف کاغذات بکھرے پڑے ہیں اور ہنری نارتھپ انہیں پڑھ کر ایپس کو سنا رہے ہیں۔ لکڑیاں ڈال کر میں کمرے سے باہر جانے لگا تو ایپس نے پوچھا:

"پلیٹ! تو اِن صاحب کو جانتا ہے؟"

"ہاں جناب میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ان کو جانتا ہوں۔"

"یہ کہاں رہتے ہیں؟"

"نیویارک میں۔"

"تو بھی کبھی وہاں رہا ہے؟"

"ہاں جناب! میں وہیں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی"

"تو کالے ٹٹو! جب میں نے تجھے خریدا تھا اُس وقت مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تو پیدائشی طور پر آزاد شہری ہے۔"

اس سوال کا جواب میں نے جس لہجے میں جواب دیا اِس کی شاید اُسے توقع نہ تھی۔ ''ماسٹر ایپس ! آپ نے بھی تو مجھ سے پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی۔ اس بات سے قطع نظر، جب میں نے اپنے پہلے مالک کو جس نے کہ مجھے اغوا کیا تھا یہ بتایا کہ میں آزاد شہری ہوں تو اس نے مجھ پر اتنے کوڑے برسائے تھے کہ میں قریب المرگ ہو گیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص نے تمہارے لئے خط لکھا تھا۔

کون ہے وہ؟'' ایپس نے حاکمانہ انداز میں سوال کیا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو پھر کڑک کر پوچھا

''یہ خط کس نے لکھا ہے؟''

''شاید خود میں نے۔''

''تمہارا راتوں رات مارکس وِل جانا اور واپس آنا ممکن نہیں۔''

اس کے بعد اس نے غلیظ زبان استعمال کرتے ہوئے خط لکھنے والے سے انتہائی وحشیانہ انتقام لینے کا عہد کیا۔ پھر مسٹر ہنری نارتھپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''اگر مجھے آپ کی آمد کی اطلاع صرف ایک گھنٹہ پہلے مل جاتی تو آپ کو اسے نیویارک واپس لے جانے کی زحمت نہ ہوتی۔ میں اس کو دلدلی علاقے میں ایسی گمنام جگہ غائب کرا دیتا کہ روئے زمین کے تمام شیرف مل کر اسے تلاش کرتے تو نہ پا سکتے۔''

میں وہاں سے نکل کر باورچی خانے کی طرف آ گیا جہاں انٹی فیبی کو

میری رہائی کی خبر ہو چکی تھی، جوش و مسرت کے ساتھ انہوں نے لڑکھڑاتے ہو
الفاظ میں مجھے مبارکباد پیش کی۔ اسی اثناء میں مسز ایپس بھی باورچی خانے میں آ
گئیں۔ انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ وہ ایک ذاتی ملازم سے محروم ہو گئیں ہیں۔
آج میرے بجائے پٹیسی کو آزادی نصیب ہوتی تو یہ ان کے لئے بڑی مسرت کا
دن ہوتا۔ بہرحال ان کا کہنا تھا کہ اب مجھے وائلن کون سنایا کرے گا اور کون
گھریلو فرنیچر کی مرمت اور دیکھ بھال اتنی خوبی سے کرے گا۔ اسی اثنا میں ماسٹر
اور سب لوگ کمرے سے باہر آ چکے تھے۔

ایپس نے بوب سے اپنی سواری کا گھوڑا منگوایا۔ دوسرے تمام غلام سزا
سے بے خوف ہو کر اور کام چھوڑ کر یارڈ میں کیبنوں کے پیچھے اکٹھے ہو گئے تھے۔
وہ مجھے اشارے سے بلا کر معاملے کی پوری تفصیل جاننا چاہتے تھے۔

شیرف نے ایپس سے قانونی کارروائی کے طور پر ضروری کاغذات پر
دستخط لئے اور اگلے دن صبح اُسے مارکس وِل کورٹ میں حاضر ہونے کا پابند کر کے
ہنری نارتھپ کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں داخل ہو گئے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ کی
سیٹ پر بیٹھنے والا تھا کہ مسٹر شیرف نے کہا کہ میں مسٹر اور مسز ایپس کو خدا حافظ کہہ
لوں۔ میں صحن کی طرف دوڑا جہاں وہ دونوں کھڑے تھے اور ہیٹ سر سے جدا
کرتے ہوئے میں نے کہا۔

''مسز ایپس! خدا حافظ، جواب میں مسز ایپس نے بھی خدا حافظ کہا۔
''ماسٹر ایپس خدا حافظ'' کے جواب میں ایپس نے بہت بُرا منہ بنا کر
کہا۔ ''او حبشی! تو ابھی اپنے کو آزاد مت سمجھ۔ میں کل تجھے مارکس وِل میں دیکھ
لوں گا۔''

میں بہر حال ایک سیاہ فام اپنی حیثیت سے آگاہ آدمی تھا پھر بھی ایک دفعہ میرا جی تو چاہا کہ بڑھ کر اس کو ایک ایسی الوداعی لات رسید کروں کہ وہ تاعمر یاد رکھے لیکن صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے صبر سے کام لیا۔

میں واپس گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میری گردن میں اپنے بازو حمائل کر دیئے۔ یہ پٹیسی تھی جو آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پلیٹ! تم آزاد ہو کر دور جا رہے ہو جہاں ہم لوگ تم کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ تم نے مجھے کتنی بار کوڑوں کی مار سے بچایا۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ تم آزاد ہو گئے۔ خدایا! خدایا میرا کیا بنے گا!"

میں اس سے جدا ہو کر گاڑی میں سوار ہو گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو پٹیسی زمین پر گری پڑی تھی۔ انکل ابرام، وِلے، بوب اور انٹی فیبی پھاٹک پر کھڑے حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ میں نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا لیکن گاڑی نے موڑ کاٹا اور وہ سب میری نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے۔

منگل چار جنوری کو میں، ایپس، اس کا وکیل ٹیلر، ہنری نارتھپ، شیرف، سب لوگ عدالت کے ایک کمرے میں جمع ہوئے جہاں مسٹر ہنری نارتھپ نے میرے بارے میں حقائق بیان کر کے تمام حلف نامے پیش کئے۔ شیرف نے گزشتہ روز کپاس کے کھیت کا منظر اور وہاں ہونے والی گفتگو سنائی۔ ایک بار پھر مجھ پر سوالات کر کے جرح کی گئی۔ آخر میں ایپس کے وکیل مسٹر ٹیلر نے اسے یقین دلایا کہ مقدمے بازی میں سوائے خرچ بڑھنے کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے مشورے کے مطابق کورٹ پیپر پر ایک تحریر تیار کی گئی جس پر متعلقہ افراد

نے دستخط کئے اور جس کے اندر اپیس نے میرے حق آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے نیویارک کے مجاز افسر یعنی مسٹر ہنری نارتھپ کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد مسٹر نارتھپ اور میں دریائے سرخ کے ساحل پر پہنچے اور سب سے پہلے روانہ ہونے والے اسٹیمر میں بیٹھ کر اُس خطۂ ارض کو الوداع کہا جہاں بارہ سال قبل مجھے پابندِ غلامی کیا گیا تھا۔

۲۲

جب روانگی کا ہارن بجا اور اسٹیمر نے نرم روی کے ساتھ مارکس وِل کا ساحل چھوڑتے ہوئے نیو آرلئن کا رُخ کیا اس وقت کے میرے جذبات کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ خوشی میرے روئیں روئیں سے پھوٹ رہی تھی۔ میں پورے عرشے پر رقص کے عالم میں اپنے محسن کے گرد دیوانہ وار چکر لگا رہا تھا جس نے میری نجات کی خاطر سینکڑوں میل کے سفر کی صعوبتیں اُٹھائیں۔ کبھی میں اس کا پائپ روشن کرتا اور کبھی اس کے معمولی اشارہ کا منتظر ہوتا کہ وہ مجھ پر کوئی حکم چلائے۔

نیو آرلئن میں ہم نے دو دن قیام کیا۔ یہاں میں نے مسٹر نارتھپ کو

تھیوفلس فری مین کے غلاموں کا وہ باڑہ بھی دکھایا جہاں سے پہلی بار ماسٹر فورڈ نے مجھے خریدا تھا۔ ہم اٹارنی مسٹر جینس سے جا کر ملے جن کے نام سینیٹر مسٹر سِول نے تعارفی خط دیا تھا۔ ان صاحب کا شمار نیو آرلئن کے معززین میں ہوتا ہے انہوں نے اپنے دستخط اور سرکاری مُہر کے ساتھ میرے لئے ایک پروانہ راہداری بنا کر دیا تاکہ وطن پہنچنے تک راستے میں کوئی سول یا پولس کا محکمہ تعرض نہ کرے۔

۸؍جنوری کو ہم لوگ بذریعہ ریل چارلسٹن پہنچے جہاں اسٹیم بوٹ پر سوار ہو کر رچمنڈ ہوتے ہوئے ۱۷؍جنوری ۱۸۵۳ء کو واشنگٹن وارد ہوئے۔ یہاں معلوم کرنے پر پتا چلا کہ برچ اور ریڈ برن دونوں بدستور اسی شہر میں مقیم ہیں چنانچہ ہم نے سب سے پہلے واشنگٹن کے پولس مجسٹریٹ کے پاس جیمز برچ کے خلاف اپنے اغوا اور بطور غلام فروخت کرنے کی رپورٹ درج کرائی جس پر جسٹس گوڈرڈ نے فوراً وارنٹ جاری کر دیا اور اسی دن برچ کی گرفتاری بھی عمل میں آ گئی تاہم اس نے اگلے ہی روز عدالت سے رجوع کر کے تین ہزار ڈالر کے عوض ضمانت پر رہائی حاصل کر لی۔ ۱۹؍جنوری کو جب مقدمہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا تو سینڈی ہل کے ایک وکیل مسٹر آرول کلارک اور ہنری نارتھپ وکلائے استغاثہ جب کہ مسٹر بریڈ لے ایڈوکیٹ وکیل صفائی کے طور پر پیش ہوئے۔ سب سے پہلے مسٹر آرول کلارک نے میرے بارے میں عدالت کو بتایا کہ وہ مجھے بچپن سے اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے میرے اور میرے والد کے آزاد شہری ہونے کے دستاویزی ثبوت بھی پیش کئے۔ استغاثے کے پہلے گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ واشنگٹن کا شہری ہے اور برچ کو چودہ سال سے جانتا ہے۔ ۱۸۴۱ء میں وہ ولیم کے غلاموں کے بندی خانے کا نگراں اور منتظم تھا

اور اسی دوران مجھے وہاں لا کر رکھا گیا تھا۔ اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ۱۸۴۱ء کے موسمِ بہار میں برچ نے مجھے غلاموں کے باڑے میں رکھا تھا۔

برچ کی طرف سے بنجمن شیکل بطور گواہ پیش ہوا۔ وہ بظاہر ایک بد تہذیب اور نامعقول شخص معلوم ہو رہا تھا جس کا اندازہ اس جواب سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے وکیل صفائی کے پہلے سوال کا دیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ تیکھے انداز میں وہ بولا۔

''میں انٹاریو کاؤنٹی نیویارک میں پیدا ہوا تھا اور میرا وزن چودہ پونڈ تھا'' اس نے اپنے بیان میں بتایا کہ ۱۸۴۱ء میں واشنگٹن میں ''ہوٹل اسٹیم بوٹ'' اس کی ملکیت تھا اور اس نے مجھے اُسی سال موسمِ بہار میں ہوٹل میں دیکھا تھا۔ ہوا یوں کہ پہلے دو آدمی ہوٹل میں داخل ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس جارجیا کا ایک نیگرو غلام برائے فروخت ہے جو کہ ایک اچھا راج مستری ہے اور عمدہ وائلن بھی بجا لیتا ہے۔ برچ نے غلام کو اندر لانے کو کہا جب اس کو لایا گیا تو یہی (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) شخص تھا۔ بیان جاری رکھتے ہوئے شیکل نے کہا ''برچ نے غلام کو بتایا کہ اگر اس نے اسے خرید لیا تو وہ جنوبی ریاست بھیج دے گا۔ غلام نے کہا اسے کوئی اعتراض نہیں ہے اور وہ جنوب کی طرف جانا پسند کرے گا۔ میرے علم میں ہے کہ برچ نے ۶۵۰ ڈالر ادا کر دیئے تھے مجھے اس کے نام کا علم نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ سالومن تو نہیں تھا۔ مجھے ان دو آدمیوں کے نام بھی نہیں معلوم جو اسے لائے تھے۔ خریداری کے بل پر ہوٹل کے بار روم میں دستخط ہوئے تھے۔ ۱۸۳۸ء سے قبل برچ میرا پارٹنر تھا اور غلاموں کی خرید و فروخت ہمارا کاروبار تھا۔ ۱۸۳۸ء کے بعد برچ نیو آرلین کے

مسٹر فری مین کا شریکِ کار بن گیا۔ برچ یہاں غلام خریدتا اور فری مین وہاں نیو آرلین میں فروخت کرتا تھا، بہر حال اس سودے کے دوران یہ لوگ دو تین گھنٹے میرے ہوٹل میں ٹھہرے جس کے دوران اس نے وائلن بھی بجایا۔"

شیکل کے بعد بنجمن تھارن نے گواہی دیتے ہوئے بتایا۔ "میں ۱۸۴۱ء میں شیکل کے پاس کام کرتا تھا وہیں ایک بار میں نے ایک نیگرو کو وائلن بجاتے دیکھا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اس کا مالک اس کو فروخت کرنا چاہتا ہے اور نیگرو نے میرے سامنے خود یہ تسلیم کیا تھا کہ وہ ایک غلام ہے۔ رقم کی ادائیگی کے وقت میں موجود نہیں تھا، میں بہر حال قسم کھا کر نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی نوجوان نیگرو ہے۔"

اس کے بعد مجھے خود بیان دینا تھا لیکن عدالت نے میرا بیان اور گواہی میرے سیاہ فام ہونے کی وجہ سے نامنظور کر دی جبکہ میرے آزاد شہری ہونے پر کوئی تنازعہ یا شک نہیں تھا۔

شیکل کے بیان کے مطابق میرے فروخت کی ایک دستاویز (بل) تیار ہوئی تھی اس لئے برچ کو حکم دیا گیا کہ وہ عدالت میں پیش کرے لیکن اس نے حلفیہ بیان میں کہا کہ سودے کی دستاویز بنی تو تھی اور اس پر دونوں پارٹیوں کے دستخط بھی لئے گئے تھے مگر بعد میں کہیں گم ہو گئی۔ اس پر مجسٹریٹ سے درخواست کی گئی کہ برچ کے گھر ایک پولس افسر کو بھیج کر سال ۱۸۴۱ء کے خرید و فروخت کے کھاتے منگوا لئے جائیں۔ چنانچہ کھاتے تو عدالت میں پیش کر دئے گئے لیکن اس پورے سال کے دوران میری فروخت کا کوئی اندراج نہیں پایا گیا۔ آخر میں عدالت نے فیصلہ سناتے ہوئے برچ کو اِس یقین کے ساتھ بری کر دیا کہ اس

نے عمداً میرے معاملے میں کوئی زیادتی یا خلاف قانون عمل نہیں کیا۔ اس طرح سازش اور جھوٹی گواہیوں کے زور پر ایک بردہ فروش مجرم قانون اور انصاف کی نظر میں معصوم اور معزز شہری قرار پایا۔

اس کارروائی کے بعد برچ اور اس کے حواریوں نے مجھ پر الزام لگا کر قانونی چارہ جوئی شروع کی کہ میں نے دو گوروں کے ساتھ سازش کر کے برچ سے دھوکا دہی اور ٹھگی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کوشش میں انہیں کتنی کامیابی ہوئی اس کا احوال نیویارک ٹائمز کے اگلے ہفتے کے شمارے میں اس طرح شائع ہوا تھا:

''برچ کے وکیل نے ایک حلفی بیان برچ کے دستخطوں سے پیش کر کے نیگرو (سالومن) کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کرا لیا۔ اس حلفی بیان کے مطابق نیگرو نے دو گوروں کے ساتھ سازش کر کے برچ سے ساڑھے چھ سو ڈالر ٹھگ لئے۔ چنانچہ نیگرو کو گرفتار کر کے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا گیا برچ اور اس کے گواہ عدالت میں پیش ہوئے جبکہ مسٹر ہنری نارتھپ مدعا علیہ کے وکیل کے طور پر پیش ہوئے انہوں نے عدالت سے کارروائی میں تعجیل کی التجا کی۔ لیکن اسی دوران نامعلوم وجوہات کی بنا پر برچ نے شیکل کے مشورے سے اپنی شکایت واپس لینے کی درخواست پیش کر دی۔ اس پر مسٹر ہنری نارتھپ نے مجسٹریٹ سے کہا کہ اس موقع پر مزید وضاحت بھی کر دی جائے کہ اس کیس کی واپسی مدعا علیہ کی مرضی یا درخواست پر نہیں کی جا رہی۔ چنانچہ عدالت نے برچ کی شکایت کو اپنے ریکارڈ میں فائل کرتے ہوئے مقدمہ خارج کر دیا۔''

ممکن ہے کہ کچھ لوگ غلاموں کے اس تاجر (برچ) کے الزام کو درست سمجھیں کیونکہ اُس کے مقابلے میں میری حیثیت محض ایک سیاہ فام غریب انسان

کی تھی جو ایک حقیر اور پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جھوٹے، ظالم اور مالدار شخص کے مقابلے میں میری نحیف آواز کسی کے کانوں تک کہاں پہنچ سکتی تھی۔ تاہم میں خدا کو گواہ بناتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ مجھ پر یہ الزام کہ میں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی شخص سے اپنے آپ کو فروخت کرنے یا اس مقصد سے واشنگٹن جانے اور ولیم کے بندی خانے میں گرفتار ہونے کی سازش کی تھی سرتاسر غلط اور قطعی بے بنیاد تھا۔ میں کبھی ہوٹل اسٹیم بوٹ ہاؤس نہیں گیا نہ ہی اس سے پہلے شیکل اور تھارن کو دیکھا یا ان سے ملا تھا۔ اگر یہ الزامات درست ہوتے تو ظاہر ہے کہ میں آزادی ملنے کے بعد کسی صورت میں برچ کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی جرأت ہی نہ کرتا بلکہ اس کو تلاش کرنے کے بجائے اس سے بچ کر نکلنے کی کوشش کرتا۔ میں تو اس کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتا تھا تاکہ دوسروں کو آئندہ ایسے جرائم کی ہمت ہی نہ پڑے اور میرے جذبۂ انتقام کو بھی کسی حد تک تسکین ہو جائے۔ بہرحال دنیا کی ایک عدالت سے تو وہ سزا سے بچ گیا لیکن ایک دن وہ خدا کی عدالت سے کیسے بچے گا جہاں نہ جھوٹی گواہیاں کام آئیں گی اور نہ نقلی دستاویزات چلیں گی۔

۲۰ رجنوری ۱۸۵۳ء کو ہم لوگ واشنگٹن سے روانہ ہوئے اور فلاڈلفیا نیویارک اور البنی کے راستے سفر کرتے ہوئے ۲۱ رجنوری کی شام کو سینڈی ہل پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر جب میں نے اردگرد شناسا چہروں اور اپنے پیارے دوستوں کو دیکھا تو میرا دل جوشِ مسرت سے بے قابو ہونے لگا۔ اگلی صبح میں اپنے چند قریبی ساتھیوں اور دوستوں کے ہمراہ گلن فالز کی طرف روانہ ہوا جہاں این اور بچے رہائش پذیر تھے۔ ان کے پُرسکون کاٹیج میں داخل ہونے پر سب سے پہلے میری

نظر اپنی بیٹی مارگریٹ پر پڑی لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکی ۔ جدائی کے وقت گڑیوں سے کھیلنے والی سات سال کی بچی اب ایک نوجوان شادی شدہ خاتون کے روپ میں روشن آنکھوں والے بھولے بھالے بچے کے ساتھ کھڑی تھی جس کا نام اس نے اپنے مفقود الخبر باپ کے نام پر سالومن نارتھپ سٹانٹن رکھا تھا۔ جب میں نے بتایا کہ میں کون ہوں تو جذبات کی شدت سے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر دوسرے کمرے سے چھوٹی بیٹی الزبتھ اور این نمودار ہوئیں اور تینوں مجھ سے لپٹ گئیں۔ پھر تو آنسوان کے عارض سے ڈھلکتے ہوئے میری گردن بھگونے لگے۔ جب جذبات کا طوفان تھما تو ہم آتشدان کے قریب بیٹھ گئے اور ہجر و فراق کے بارہ برسوں کے دوران دونوں طرف پیش آنے والے مصائب و آلام، غم و اندوہ اور امید و بیم کے واقعات بیان ہونے لگے۔ این نے بتایا کہ الانزو ایک عرصے سے ریاست کے مغربی حصے میں روزگار کے سلسلے میں گیا ہوا ہے۔ اس نے حال ہی میں اپنی ماں کو خط لکھ کر بتایا ہے کہ وہ میری آزادی کے حصول کے لئے کافی رقم جمع کر رہا ہے اور جلد ہی جنوب کی ریاستوں کی طرف میری تلاش کے لئے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دراصل ان لوگوں کو کلم رے کے چند سال پہلے کے بھیجے گئے خط سے میری غلامی کی صورتِ حال کا علم تو ہو گیا تھا لیکن ان کو میرے علاقے وغیرہ کا اندازہ نہ تھا۔ این نے بتایا کہ ایک دن الزبتھ اور مارگریٹ نے اسکول سے آکر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ سبب دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے جغرافیہ پڑھتے ہوئے چند ایسی تصویریں دیکھیں جن میں لوزیانہ کی ریاست میں واقع کپاس کے کھیتوں میں غلاموں کو کام پر دکھایا گیا تھا اور جن کے پیچھے اوورسیران کو دڑوں سے مارتے ہوئے مشقت لے رہے تھے۔ اس خیال

نے بچوں کو بہت رُلایا کہ ان کا باپ بھی کسی ایسی ہی مصیبت میں گرفتار ہوگا اور یہ خیال حقیقتِ حال سے مختلف نہ تھا۔

اب میں اپنی داستانِ الم ختم کر رہا ہوں۔ میں اتنا پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں کہ غلامی کے موضوع پر کوئی طول طویل گفتگو کر سکوں۔ یہ قارئین اور خصوصاً دانشوروں کا کام ہے کہ اس مروجہ غیر انسانی نظام پر اظہارِ خیال کریں۔ دوسری ریاستوں میں غلامی اور جبری غلامی کی صورتِ حال سے تو میں آگاہ نہیں ہوں لیکن ریڈ ریور کے علاقے کے حالات میں نے اس آپ بیتی میں حرف بہ حرف سچ اور درست بیان کر دئے ہیں۔ اس میں قطعی طور پر کوئی مبالغہ آرائی یا داستان طرازی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت بھی سینکڑوں آزاد شہری ٹیکساس اور لوزیانہ کے چھوٹے بڑے زرعی فارموں پر جبری مشقت پر مامور ہیں جنہیں اغوا کر کے اور غلام کی حیثیت سے فروخت کر کے یہاں پہنچایا گیا ہے۔

آخر میں، میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس کے کرم سے میری آزادی بحال ہوئی اور توقع کرتا ہوں کہ میں اپنی بقیہ زندگی سکون کے ساتھ گزار کر اپنے والد کی آخری آرام گاہ کے ساتھ دائمی طور پر محوِ خواب ہو جاؤں گا۔